سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۲۱۶

مختصر تاریخ تمدّن

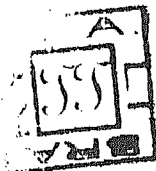
مصنفہ

جان ایس ہائی لینڈ۔ ایم۔ اے (کیمبرج)

مترجمہ

سید مبارز الدین رفعت صاحب

شائع کردہ



انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

طبع اوّل

سنہ ۱۹۴۴ء

قیمت مجلد [illegible] بلا جلد [illegible]

سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) نمبر ۲۱۶

مختصر تاریخِ تمدن

مصنّفہ

جان ایس ہائی لینڈ ایم۔ اے (کیمبرج)

مترجمہ

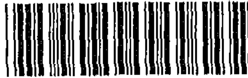
سیّد مبارز الدین رفعت صاحب

شائع کردہ

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

طبع اوّل — ۱۹۴۴ء — قیمت مجلد سے ۸؍ بلا جلد عہ ۸؍

فہرست مضامین



مطبوعہ
(ہمدرد پریس دہلی)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

تاریخ کی ابتدا

زمین کی پیدائش

بے شمار قرنوں پہلے آفتاب، زمین، سیارے اور ان کے چاند سب مل کر ایک شعلہ زن گیس تھے۔ تیزی سے گردش کرنے والی یہ دہکتی ہوئی گیس جب رفتہ رفتہ سرد ہونے لگی تو اس کے ٹکڑے الگ ہونے لگے۔ یہ ٹکڑے آہستہ آہستہ سخت ہوتے ہوئے سیارے اور ان کے چاند بن گئے۔ چوں کہ یہ الگ الگ نظامِ شمسی کے ارکان اپنی ماں سے بہت چھوٹے تھے، اس لیے مرکزی آفتاب کے مقابلے میں یہ جلد سرد ہو گئے۔ اس طرح ہماری زمین ایک عرصۂ دراز کے بعد موجودہ حالت کو پہنچی۔ اس کا اندرونی حصّہ گرم اور اس کی بیرونی سطح سخت اور سرد ہے۔ یہ مرکزی آفتاب سے روشنی اور حرارت حاصل کرتی ہے جو ابھی تک بے حد مشتعل ہے۔ ابتدا میں جب خود زمین بھی بے حد گرم تھی، تمام سمندروں کا پانی کرۂ ہوا میں وسیع ابر کی شکل

میں بخار بنا ہوا تھا۔ جیسے جیسے سردی کے مدارج طے ہونے لگے، بخار کثیف ہو کر بارش میں تبدیل ہوتا گیا اور اس طرح سمندر عالم وجود میں آئے۔[۱]

زندگی کی ابتدا بہت زمانے کے بعد غالباً ان گرم سمندروں کے ساحلوں پر سب سے پہلے زندگی کا ظہور ہوا۔ اس زندگی کا طریقۂ ظہور اب تک سربسر راز ہے۔ پہلا ذی حیات مادہ غالباً ایک نرم اور چپچپی سی شے تھی، جس میں ہڈی اور صدف کا وجود نہ تھا۔ یہ مادہ تقسیم ہوتا ہوا بڑھتا گیا۔ اس کے بعد سمندر کی تہ میں اسی مادے سے سمندری کائی، گھونگے، کیکڑے اور کیڑے پیدا ہوئے اور آخر میں مچھلیاں وجود میں آئیں۔ زندگی کی ان ابتدائی شکلوں میں سے بہت سی شکلوں کے متعلق آج ہمارے پاس ٹھیک ٹھیک صحیح معلومات موجود ہیں، کیوں کہ (مثلاً) جب گھونگے مر گئے تو ان کی سخت سیپیاں سمندر کی تہ کی کیچڑ میں دفن رہ گئیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے دریاؤں کے ذریعے ریت اور نرم مٹی زمین سے بہ بہ کر سمندر میں آتی گئی، کیچڑ کی تازہ تہیں ان پرانی سیپیوں پر جمتی گئیں۔ یہ کیچڑ اوپر کے مسلسل بڑھتے ہوئے بوجھ کے دباؤ سے بتدریج سخت ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے چٹان کی شکل اختیار کر لی۔ پھر کئی زمانوں بعد یا تو کسی اچانک زلزلے یا تقسیم وزن میں آہستہ آہستہ وقوع پزیر تغیرات نے، جو سطح زمین پر کہیں ہوئے تھے، سمندر کی تہ میں کیچڑ کی ان چٹانوں کو اُبھار دیا تاکہ وہ خشک زمین کا ایک حصہ یا پہاڑوں کا بلند سلسلہ بن جائیں۔ اس حالت میں یہ

---

[۱] اب بعض سائنس دانوں کا دعوا ہے کہ دوسرے ستاروں کی طرح زمین کی تکوین بے شمار سرد شہابیوں کے وفتاً مل کر آنے سے ہوئی۔ ان شہابوں کے تصادم نے بے حد حرارت پیدا کر دی تھی۔

چٹانیں بارش اور ندیوں کے بہاؤ سے کٹ گئیں اور اسی طرح ایک عرصۂ دراز کے بعد گھونگوں کی وہ پرانی سیپیاں جو ان چٹانوں میں دفن تھیں، نمودار ہوگئیں۔ اس طرح ہم قدیم جان داروں کی سیپیوں اور ہڈیوں کو بہت بڑی تعداد میں چٹانوں میں دفن دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی باقیات "رِکاز" کہلاتی ہیں۔

غالباً زمین کے سرد ہونے کے کم سے کم ایک ارب سال گزرنے کے بعد پہلی چٹانیں بنیں۔ اس طول طویل مدت کا نصف زمانہ گزرنے سے پہلے کافی سخت اعضا کے ساتھ کسی جان دار مخلوق نے ارتقا نہیں پایا تھا کہ وہ رِکاز کے طور پر چٹانوں میں محفوظ رہ سکتی۔

زندگی کا ارتقا اب عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ زندگی کے ارتقا کا ایک بلا فصل عمل انسان کے عالمِ وجود میں آنے تک مسلسل جاری رہا۔ مختلف وقتوں میں خفیف تغیرات نے ایک انفرادی جان دار کو دوسرے انفرادی جان دار کے مقابلے میں ان کی شکل و صورت، دشمنوں سے اپنی حفاظت اور بچوں کی پرورش کے بارے میں بہتر مواقع عطا کیے۔ ایسے جان دار جو کم زور تھے یا اپنی حفاظت کے سامان سے آراستہ نہیں تھے، یا تو مار ڈالے گئے یا خود انھیں بھوکوں مرنا پڑا اور وہ اپنی نسل کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس لیے قاعدے کے طور پر پہلی نسل سے دوسری نسل کے لیے ایسے جان دار چھانٹے گئے جو زیادہ مضبوط اور سامانِ حیات سے زیادہ آراستہ تھے۔ اس طرح مستقل ترقی کی بنیاد پڑی۔ نئی قسم کے جان دار یک بہ یک عظیم تغیرات یا ایسے معمولی تغیرات کے جمع ہوجانے سے جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے، یا تدریجی موسمی تغیرات اور دوسرے حالات میں عالمِ وجود میں آئے ہوں گے جن کی وجہ سے مخصوص جان دار ہی پھلے پھولے (یعنی ایسے جان دار جو سرد نسلوں نے

میں سفید بال رکھتے تھے) اسی طرح آخر کار یہ جان دار ایک جدید مخلوق کے ارتقا تک جیتے رہے۔

پھر ایسے صفات کے حامل بعض جان دار پیدا ہوئے جو بالکل مختلف حالات میں زندہ رکھنے کے قابل تھے۔ زندگی کی جدید تنظیم کے پیش رو غالباً یہی تھے۔ معمولی مینڈک خود اپنی زندگی کی داستان سے اس قسم کے تغیر کی ایک دل چسپ مثال پیش کرتا ہے۔ اپنی ابتدائی منزلوں میں وہ مچھلی ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ خشکی کا ایسا جانور بن جاتا ہے جو پھیپھڑوں سے سانس لیتا ہے۔

یہ موضوع ابھی پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے خصوصاً وہ طریقہ کار جس سے جدید نشو و ارتقا توارث اختیار کرتا ہے، ابھی تشنہ ہے لیکن رکاز اور موجودہ جانوروں کی تاریخِ حیات کے مطالعے اور متعدد دوسرے ذرائع سے ابتدائی ذی حیات مخلوق سے لے کر خود انسان تک ارتقا کے ایک واضح سلسلے کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔

ہوام، پرندے اور پستانیے

پہلے پہل زندگی نے پودوں کی صورت میں رفتہ رفتہ سمندر سے نمودار ہو کر خشک زمین میں اپنا گھر بنایا۔ بڑے بڑے جنگل پیدا ہوئے، سرسبز ہوئے اور سڑ گل گئے۔ ان کے رکاز آج ہمیں معدنی کوئلے کی صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ان قدیم جنگلوں میں بہت سے بڑی شکل کی حیاتِ حیوانی متعدد زمانوں تک کیڑوں کی شکل میں رہی۔ ان میں سے بعض بہت جسیم تھے۔ اس کے بعد سب سے پہلے ہوام نمودار ہوئے۔ یہی ہمارے سانپوں، چھپکلیوں اور مگرمچھوں کے پیش رو ہیں۔ ان ابتدائی ہواموں میں بعض نہایت عظیم الجثّہ تھے۔ ان کے باقی ماندہ رکاز سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا طول

سو فٹ سے بھی زیادہ تھا۔ ان میں سے بعض درختوں کے پتّے اور بعض گوشت کھاتے تھے۔

ان ہواموں کے بعد پرندے پیدا ہوئے۔ پہلے پہل یہ بڑی بڑی چمگادڑوں سے مشابہ تھے۔ ان کے پر یا حقیقی پنکھ نہ تھے، مگر بڑے بڑے زبردست دانت ہوتے تھے۔ اس کے بعد حقیقی پرندے نمودار ہونے شروع ہوئے۔

اس کے بعد زمین کے مدار اور اس کے محور میں تبدیلی کی وجہ سے ضرور ہی کہ ایک اچانک تغیّر پیدا ہوا ہو۔ اس سے تمام یا تقریباً تمام بڑے بڑے ہوام غائب ہو گئے۔ ان کے مرنے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ ان کے پوست اور چھلکے شدید سرد زمانے میں ان کی کافی حفاظت نہ کر سکے۔ غالباً ایک طویل وقفے کے بعد بڑے پستانیوں[1] نے ان کی جگہ لے لی۔ ہواموں کے عہد میں پستانیے نشو و ارتقا پا رہے تھے، مگر غالباً یہ چوہوں سے زیادہ بڑے نہ تھے۔ جب بڑے بڑے ہوام غائب ہو گئے تو پستانیوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا اور ان کی متعدد اور مختلف قسمیں ظاہر ہونے لگیں۔ ماحول کے دباؤ اور ان کی ذاتی قابلیتوں نے ان کی رہبری کی کہ وہ ایسا طریقۂ زندگی اختیار کریں جس سے بہتر سے بہتر طریقے پر ان کی بقا ممکن تھی۔ ان میں سے بعض پانی میں واپس چلے گئے (جیسے وہیل مچھلی) اور بعض درختوں پر چڑھ گئے (جیسے بندر) مگر تقریباً یہ تمام

---

[1] ہوام انڈے دیتا ہے۔ اس کے جسم پر چھلکے ہوتے ہیں، مگر بال نہیں ہوتے۔ پستانیہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے جو انڈوں سے پیدا نہیں ہوتے۔ مچھلی کی طرح ہوام اپنے بچوں سے بہت بے پروا ہوتا ہے، مگر پستانیے کی یہ خصوصیت کہ وہ اپنے بچوں کی بڑی حفاظت کرتا ہے، اعلا سے اعلا قسم کے نشو و ارتقا کو ترقی دینے والے اہم محرکات میں ہے۔

مختلف قسم کے بتلاتیے ایک ہی اعلا اور اہم سمت میں ترقی کر رہے تھے۔ یعنی اپنے ماحول پر پوری طرح اثر انداز ہونے اور بقا کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک عظیم تر دماغ کا ارتقا۔

ان دور دراز زمانوں میں پائے جانے والے حیوانوں میں بعض نہایت ہی عظیم الجثہ تھے۔ غالباً ایک ارب سال پہلے ان ہی میں سے خود راست انسان کے مورث پیدا ہوئے۔ یہ مخلوق دنیا میں اس وقت جو جانور موجود ہیں ان کی بہ نسبت انسان سے زیادہ مشابہ تھی، لیکن ہمارے علم میں اس وقت جو ادنا ترین انسانی نسل ہے، یہ ان سے بھی بہت کم درجے پر تھی۔

انسان کی تخلیق

ہمیں اس کا علم نہیں کہ کس طرح، کب یا کہاں پہلی مرتبہ انسان روئے زمین پر نمودار ہوا۔ بہت ممکن ہے اس کا اصلی وطن ایشیا یا اس سے متصل جزیروں میں رہا ہو۔ اس کے دانت جو فطرتاً میوے اور نرم جڑیں کھانے کے لیے موزوں ہیں، ان کی ساخت کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ منطقہ حارّہ کی آب و ہوا میں جہاں سال بھر ایسی غذا مل سکتی ہے، انسان کے اندر پیدا ہوئے۔ ہمیں اس کا بھی ٹھیک ٹھیک علم نہیں کہ ابتدائی انسان کو بقیہ حیوانی مملکت سے ملانے والے ماقبل انسانی مورثوں کا کیا حال تھا۔ غالباً اس کا قریب ترین مورث ایک بڑا سا بندر تھا۔ اس کے ہاتھ پیر، چمپانزی یا گوریلا بندر سے مشابہ تھے، لیکن اس کے پیر مضبوط اور ہاتھ نسبتاً چھوٹے تھے۔

بعض لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ اس طرح انسان کو حیوانوں کی نسل سے ثابت کرنا نہ صرف انسان کو ذلیل کرنا ہے بلکہ خدا کی بھی توہین کرنی ہے جو اس کا خالق ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جس صبر و سکون کے ساتھ ہماری نسل

کی تعمیر ہوئی ہے، جدید انکشافات اس کے بارے میں حیرت انگیز طریقۂ تخلیق کا اظہار کرتے ہیں جس کا پہلے تصور بھی کرنا محال تھا۔ خدا نے دنیا اور اس کے بسنے والوں کی کس طرح تخلیق کی، اس کا کچھ اندازہ کرنے اور اس کی صنعت و حکمت کے آگے سرنگوں ہو جانے کے لیے ہمیں سائنس کچھ اس سے بھی زیادہ آمادہ کرتی جو اس سے پہلے ممکن ہی نہ تھا۔

اوّلین انسانی نقوش

جاوا میں ایک ایسے حیوان کی رکازی ہڈیاں دریافت ہوئی ہیں جو نصف بندر اور نصف انسان تھا۔ یہ ایسی زمین کی تہوں میں پائی گئیں جس کی طبیعی حالت سے پتا چلتا ہے کہ یہ مخلوق آج سے پانچ لاکھ سال پہلے زندہ تھی۔ تقریباً اسی زمانے کے پتھر کے نہایت سادہ آلات یورپ میں بہت بڑی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ یہ دستی کلہاڑیاں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اسی قسم کی نیم انسانی مخلوق نے ٹھوکنے، پیٹنے اور لڑنے کے لیے بنایا تھا جس کی ہڈیاں جاوا میں پائی گئی ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کو ابتدائی انسان کے قطعی سلسلے کا پتا چلے، تقریباً ڈھائی لاکھ سال کا وقفہ آتا ہے۔ دوسرا واضح ثبوت جو ہمارے پاس موجود ہے، وہ چند ہڈیاں ہیں، جو جرمنی میں ہائیڈل برگ کے مقام پر پائی گئیں۔ یہ ہڈیاں، انسانی ہڈیوں کی بہ نسبت اس مخلوق کی ہڈیوں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں جو جاوا میں پائی گئی ہیں۔ مگر یہ بعید از قیاس ہے کہ یہ جبڑا انسانی گفتگو کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اسی "ہائیڈل برگ کے انسان" کے عہد میں یورپ میں خوف ناک شیر، شیر ببر، ہاتھی گینڈے اور ارنا بھینسے بستے تھے۔

اس کے بعد ہمارے علم میں تقریباً ایک لاکھ سال کا ایک اور وقفہ آتا ہے۔ پھر ہمیں سسکس میں پلٹ ڈاؤن کے مقام پر ایک ایسی مخلوق کی کھوپڑی ملتی ہے جس کا دماغ موجودہ انسان اور جاوا کے انسان کے دماغ کی درمیانی حالت میں تھا۔ اس کے بندر جیسے جبڑوں سے ثابت ہوتا ہے کہ غالباً یہ مخلوق راست انسان کی مورث نہیں بلکہ ان ہمہ جہتی ارتقاؤں میں سے ایک ارتقائی صورت تھی۔ اپنے حریفوں کے مقابلے میں یہ تنازعۂ بقا کے سامان سے اچھی طرح آراستہ نہیں تھی، اسی لیے امتداد زمانہ سے یہ بھی ہوام اور پتانیوں کی طرح روئے زمین سے مفقود ہو گئی۔

ابتدائی انسان کے اولین نقوش جو یقیناً انسانی ہیں، پچاس ہزار سے قبل سے شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ نقوش جرمنی کی ایک وادی میں پائے گئے ہیں جو نین ڈرتھال کہلاتی ہے۔ یہ "نین ڈرتھال کا انسان" نہ تو سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ اپنا سر اوپر اٹھا سکتا تھا۔ اس کے ٹھوڑی نہیں تھی اور شاید وہ گفتگو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی بندر سے مشابہ تھا، لیکن اس کی دماغی استعداد کسی بھی بندر سے کم سے کم دگنی تھی، اسے حیوانوں میں نہیں بلکہ انسانوں میں شمار کرنا چاہیے۔ نین ڈرتھال نسل کے اس ابتدائی انسان کی اور بہت سی ہڈیاں اور دوسرے نقوش جو یورپ اور افریقہ کے مختلف حصوں میں پائے گئے، ہمارے پاس موجود ہیں۔ "بعض حالات میں مُردوں کو ضروری آلات اور غذا کے ساتھ باقاعدہ طور پر دفن کیا گیا تھا تاکہ یہ دوسری زندگی میں فوراً کام آ سکیں۔ بلاشبہ نین ڈرتھال وضع کے یہ انسان اپنے سر کی ساخت میں ایک خاص حد تک بندر سے مشابہ تھے .... تاہم اس کے باوجود وہ انسان ضرور تھے اور ان کا دماغ موت کے بعد کی

زندگی پر یقین رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا[9]

اس طرح اب ہم زندگی کی ابتدا سے لے کر ان گنت زمانوں کے سست رفتار اور پر از آلام ارتقا کے بعد آخر کار انسان تک جا پہنچتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہر ہر قدم بے شمار افراد کی موت اور کل صنف کی فنا کے ذریعے غذا حاصل کرنے اور بقا کی مہیب کش مکش جاری رکھنے کے ساتھ اٹھایا گیا۔ یہ تدریجی ارتقا مکمل قربانی اور ناقابلِ شمار آلام اور مصائب پر حاوی تھا۔ اس میں حیوان حیوان کا اور نسل نسل کا شکار کر رہی تھی۔ اب یہ بات ہم پر بالکل واضح ہو کہ اپنی اولاد کے لیے اپنی جان دینے پر ماں کی رضامندی اور حیوانوں کے گروہوں میں غذا حاصل کرنے اور حفاظت کے باہمی تعاون کرنے کی قابلیت، بقا کے دو زبردست عامل ہیں۔ ماں کی محبت اور برادری کا جذبہ ایسی چیزیں تھیں جو اعلا سے اعلا قسم کی زندگی کے نشوو ارتقا میں خود انسان کی تخلیق سے مدتوں پہلے ہی بے حد اہمیت رکھتی تھیں۔

قدیم حجری عہد کا انسان

انسان کی ابتدائی نسلیں مختلف قسم کے حجری آلات بنانے میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔ یہ پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اس کی سطح اس طرح صاف کرتی تھیں کہ ان کی کوئی موزوں شکل بن جائے۔ اس کا ایک کنارہ کاٹنے کے لیے چھوڑ دیتی تھیں۔ ان آلات کو جلا دینا انھیں نہ آتا تھا۔ ہم ان انسانوں کو "قدیم حجری عہد" کا انسان کہتے ہیں۔

یہ ابتدائی حقیقی انسان جو اب سے غالباً پچاس ہزار سال پہلے دُنیا میں بستے تھے، ان کی زندگی نہایت دشوار تھی۔ ان کی دُنیا خوف ناک درندوں

---

[9] میارٹ کی کتاب "علم الانسان" صفحہ 9۔

سے معمور تھی۔ جن غاروں میں یہ رہتے تھے، انھیں حاصل کرنے کے لیے۔ بڑے بڑے شیر اور ریچھ ان سے لڑتے رہتے تھے۔ جوں جوں زمین کے محور نے واضح طور پر ترچھی راہ اختیار کی آب و ہوا سرد سے سرد تر ہوتی جاتی تھی۔ زمین کے بڑے بڑے حصے "گلیشیر" سے خوب ڈھک گئے، یہ گویا ایک عظیم برفانی عہد کی ابتدا تھی۔ ایسے گلیشیر گرین لینڈ اور ایلپس پر جن میں اب تک موجود ہیں، لیکن اس سے پہلے آگ دریافت ہو چکی تھی۔ اس کی دریافت سے تمدن کی رفتار میں بڑی تیزی پیدا ہو گئی۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے، اس انسان نے خرگوش سے بڑے جانوروں کا شکار کیا ہوگا۔ جیسے یہ شکاری تھے، غالباً خود ان کا بھی شکار کیا جاتا ہوگا۔ بیوے، انڈے، پرند، مینڈک، مچھلی، سانپ اور ایسے ہی جانوروں پر ان کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ غالباً انھیں اس بات کا بھی شعور نہیں تھا کہ آیا ان کی غذا تازہ ہے یا ادھ سڑی مگر ان میں سرداری، اور ان کی سماجی زندگی میں جماعت بندی یا چھوٹے چھوٹے قبیلوں کی ابتدا ہو گئی تھی۔

کرومیاگ نارڈ

جب گرم موسم نے پھر ایک بار برفانی عہد کی جگہ لے لی (یعنی جب زمین کا جھکاؤ اس کے محور کی بہ نسبت کم ہونے لگا) تو یورپ میں ایک نئی اور اعلا قسم کا انسان نمودار ہونے لگا۔ غالباً یہ جدید نسل اپنے پیش رو نینڈرتھال کے انسانوں سے الگ ہی پیدا ہوئی تھی۔ غالباً اس کا پہلا وطن ان سرزمینوں میں ہوگا جو اس وقت بحرِ روم میں تہ آب ہیں۔ یہ نو وارد نین ڈرتھال کے لوگوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ترقی یافتہ اور بہت زیادہ حقیقی انسان تھے۔ یقیناً اس نسل (یہ نسل کرومیاگ نارڈ"[1]

---

[1] "کرومیاگ نان" فرانس میں ایک مقام ہے۔ جہاں ان کے ڈھانچ پہلی مرتبہ دریافت ہوئے۔

کہلاتی ہے، کے بعض افراد آج کل کے انسان سے بڑا دماغ رکھتے تھے۔ یہ بڑے شکاری تھے اور گھوڑوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ ان گھوڑوں کو وہ کھایا کرتے تھے[1] مگر شاید ان پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نوبت تک کبھی جانور پالے نہیں گئے۔ ایک قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ یہ کروماگ نارڈ بہت اچھی طرح کام کر سکتے تھے۔ انھوں نے مختلف تصویریں اور خاص کر جانوروں کی تصویریں بہت اچھی بنائی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تصویریں جو غالباً مذہبی اغراض کے لیے اُتاری گئی تھیں، گہرے غاروں میں پائی گئی ہیں۔ ان کے خاکے اور رنگ نہایت شان دار ہیں اور یہ زندگی اور حرکت سے معمور ہیں۔ کروماگ نارڈ لوگوں نے ہڈیوں اور ہرن کے سینگوں پر بھی تصویریں اور نقش و نگار کندہ کیے ہیں۔ انھیں آیندہ زندگی کا پورا پورا یقین تھا۔ اس لیے وہ اپنے مُردوں کو شان دار طریقے پر دفن کرتے تھے۔ ان کے اور ان کی بعد والی نسلوں کے عہد میں جواب سے پندرہ ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے، یورپ[2] زیادہ تر وسیع اور کُھلی چراگاہوں سے پٹا ہوا تھا۔ ان چراگاہوں پر ہرنوں اور گھوڑوں کے گلے چرا کرتے تھے۔

جدید حجری عہد کا انسان

اس کے بعد آب و ہوا میں پھر ایک بڑا تغیر ہوا۔ یورپ مستقل طور پر زیادہ گرم و مرطوب ہوگیا اور رفتہ رفتہ بڑے جنگلوں سے پٹ گیا۔ ان جنگلوں میں ہم میدانوں میں رہنے اور گھوڑوں اور ہرنوں کا شکار کرنے والے انسانوں کی جگہ ایک دوسری

---

[1] ان کی ایک قیام گاہ میں تقریباً دس لاکھ گھوڑوں کی ہڈیاں پائی گئی ہیں۔

[2] صرف یورپ ہی میں (اور اس سے کچھ کم شمالی امریکہ میں) ماقبل تاریخ انسان کے آثار کی اطمینان بخش تحقیقات ہوئی ہے۔

نسل کو نمودار ہوتے دیکھتے ہیں۔ یہ نسل پتّھر کے آلات بنانے کی ایک نئی اور اعلا قابلیت رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہو کہ یہ "جدید حجری عہد" کے انسان کہلاتے ہیں۔ ان کے آلات نہایت خوب صورتی سے بنائے جاتے تھے اور جلا دینے کے لحاظ سے قدیم حجری عہد کے انسان کے آلات سے مختلف ہیں۔ جدید حجری عہد کے انسان کرومیاگ نارڈ لوگوں کی طرح تصویریں نہیں بنا سکتے تھے، مگر انھوں نے زمین جوتنے کی ابتدا کر کے تمدّن میں بڑا اضافہ کیا۔ غالباً انھوں نے انتشاری طریقۂ کاشت کو اختیار کیا تھا۔ یعنی کبھی ایک قطعۂ زمین پر کاشت کرتے تھے تو کبھی دوسرے پر۔ اس طرح کی کاشت اب بھی ہندستان کے بعض جنگلی قبیلے کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے کتّے، گائیں، اور بھیڑ بکریاں پالی تھیں۔ برتن بنانا بھی جانتے تھے۔ زیب و زینت کے لیے سونے کے استعمال سے بھی یہ واقف تھے۔ کچھ مدّت کے بعد یہ اپنے آلات اور ہتھیار پتّھر کی جگہ تانبے اور کانسی کے بنانے لگے۔ کانسی دراصل تانبے اور ٹین کا مرکب ہو اور دونوں سے زیادہ سخت ہوتی ہو۔ آخر میں غالباً تین ہزار سال پہلے لوہا استعمال ہونے لگا جو پہلے پہل کوئلے کی آگ پر پگھلایا جاتا تھا۔ دُور دراز مقامات پر رہنے والے لوگوں کے درمیان سونا، عنبر اور سخت قسم کے پتّھروں کے تبادلے میں ایک ابتدائی قسم کی تجارت وجود میں آئی۔ اس زمانے کے یورپ میں جدید حجری عہد کے بہت سے لوگ جھیلوں کے بیچ میں نہایت محنت سے ستون پر بنائی ہوئی قیام گاہوں میں رہا کرتے تھے۔ جھیلی گانو میں رہنے والے لوگوں نے اس طریقے پر وحشی درندوں اور دشمنوں اور قبیلوں کے حملوں سے اپنی حفاظت کا انتظام کیا تھا۔

بنی نوعِ انسان کی نسلیں

قدیم حجری عہد کے انسان زمین پر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ ان کی باقیات اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تقریباً ہر جگہ ایک خاص سطح تک ہی ترقی کی تھی۔ لیکن جدید حجری عہد کے یہ انسان ان سے بالکل مختلف تھے۔ تمام دُنیا میں ہم ان کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی مختلف نسلوں میں منقسم پاتے ہیں۔ ان کی ہر نسل اپنی مخصوص جسمانی خصوصیات (جلد کا رنگ، سر کی ساخت اور بالوں کی طبیعی حالت) ایک خاص معیارِ تمدّن اور اپنی زبانوں کا ایک خاص گروہ رکھتی تھی۔

شمال مشرقی یورپ اور شمال مغربی ایشیا[1] میں شمالی قفقازی نسل یا نسلیں پھیل گئیں۔ یہ سفید فام انسانوں پر مشتمل تھیں اور جنگلوں اور میدانوں میں خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ جو زبانیں بولتی تھیں، وہ آریائی زبانیں کہلاتی ہیں[2]۔

امریکہ اور مشرقی ایشیا غالباً اس وقت آپس میں ملے ہوئے تھے۔ ان میں زرد فام منگول نسل آباد ہوگئی۔ یہ نسل ایک مخصوص اور نمایاں خاندان کی زبان بولتی تھی۔ افریقہ اور منطقۂ حارّہ کے دوسرے مُلکوں میں ایک سیاہ فام نسل پھیل گئی جس کو حبشی نسل کہا جاتا ہے۔ اس نسل کی زبانیں مختلف تھیں۔

---

[1] غالباً اس وقت شمال مغربی ایشیا جنوبی ایشیا سے ایک بڑے درمیانی بحیرے کے حائل ہونے کی وجہ سے جُدا تھا۔ اس کے آثار اب بھی بحرِ اسود، بحرِ خزر اور بحرِ ارل میں پائے جاتے ہیں۔ [2] آریائی گروہ میں سنسکرت، یونانی، لاطینی اور بہت سی زندہ یوروپی زبانیں شامل ہیں۔

شمالی قفقازیوں اور حبشیوں کے درمیان جنوبی قفقازی (یا بحرِ روم کی) نسل آباد تھی۔ اس نسل کے لوگوں کا رنگ گندم گوں، بال سیاہ اور زبانیں مختلف تھیں۔ ان کی زبانوں میں سامی گروہ کی زبانوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ جنوبی قفقازی نسل دور دور تک پھیل گئی۔ ہندستان کے دراوڑی باشندے غالباً یہیں سے نکلے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ بحر الکاہل کے جزائر کے راستے وسطی اور جنوبی امریکہ پہنچے ہوں اور اس کے بعد دنیا میں چاروں طرف پھیل گئے ہوں۔

ان بڑے بڑے گروہوں کے علاوہ دوسری نسلیں اور دوسرے خاندانوں کی زبانیں بھی تھیں، مگر نسلوں اور زبانوں کی تقسیم کا پورا مضمون بہت پیچیدہ اور قیاسی ہے۔

آریا ہمیں اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ تاریخ کی ابتدا پر شمالی قفقازی یا آریا نسل جنوبی قفقازی نسل کی وجہ سے مغربی اور جنوبی سمتوں میں تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ یہ شمالی قفقازی یا آریا نسل زبانوں کی تقسیم میں آسانی کے لحاظ سے آریا کہلاتی ہے لیکن یہ غلط ہے۔ مغرب میں بڑھنے والے آریا کلٹ کہلاتے تھے۔ یہ مفتوحہ آبادی کو انگلستان، فرانس اور جزیرہ نمائے اسپین کے انتہائی مغربی جانب ڈھکیلتے ہوئے آخر کار خود بھی بحرِ ظلمات تک پہنچ گئے۔ اس کے بعد، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، آریا قبیلے مختلف ناموں کے ساتھ اطالیہ، یونان، ایران اور ہندستان میں گھس گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنا گھریلو اسباب ایسی گاڑیوں پر لاد کر آئے، جو بیلوں سے کھینچی جاتی تھیں۔ مویشی کی بڑی قدر و قیمت تھی اور یہی دولت کی خاص نشانی سمجھی جاتی تھی۔ جب یہ پھیلتے ہوئے آریا بڑے بڑے چوڑے دریاؤں یا سمندروں کے

ساحلوں پر پہنچے تو انھوں نے اپنے لیے کشتیاں بنائیں اور ان کے ذریعے انھیں پار کیا۔ یہ اپنے رہنے کے لیے لکڑی کے مکان تیار کرتے تھے اور اپنے مُردوں کو جلا دیا کرتے تھے۔ ہزارہا سال پہلے کی خانہ بدوشانہ زندگی کی طرح ابتدا میں ان کی گزر بسر مویشی پر ہوتی تھی۔ مگر جب بعد میں یہ مغرب اور جنوب میں اپنے نئے وطنوں میں مقیم ہو گئے تو انھوں نے زراعت شروع کر دی اور بیلوں سے ہل جوتنے کا کام لینا شروع کیا۔ یہ وہی بیل تھے جو بادیہ پیمائی میں ان کی گاڑیاں کھینچا کرتے تھے۔ یہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ اپنے گیت لیتے گئے۔ یہ گیت صدیوں تک ان کے تہواروں اور مذہبی رسموں کے موقعوں پر گائے جاتے رہے۔ اس طرح شمال مغرب میں ساگا، یونان میں رزمیہ داستانیں، ایران میں ژندوستا، اور ہندستان میں ویدک اشلوک وجود میں آئے۔ اس طرح آریا اپنے ساتھ ادب، تاریخ اور فلسفے کے بیج لیتے آئے۔ اگرچہ اب تک تحریر کا طریقہ ایجاد نہیں ہوا تھا، تاہم ہر چیز زبانی ایک دوسرے تک پہنچتی رہی۔ انھیں نو عمر مذہبی پیشوا یا شاعر احتیاط کے ساتھ حفظ کر لیتے تھے۔ یہ قدیم آریا الگ الگ کنبوں میں منقسم نہیں تھے، بلکہ بڑے بڑے مشترکہ خاندانوں میں رہا کرتے تھے۔ بعض وقت یہ خاندان سینکڑوں افراد پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایسے بہت سے خاندانوں کو ملا کر قبیلے بنائے گئے تھے۔ اور ہر قبیلہ اپنے سردار کا مطیع و فرماں بردار ہوتا تھا۔ اکثر یہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اپنے نئے وطنوں میں آباد ہوتے ہی اُن آریاؤں کا ہر قبیلہ اپنے حصۂ ملک پر قابض ہو گیا۔ اور اس کے مختلف خاندان گانووں میں بس گئے۔

خانہ بدوش] شمالی اور مشرقی یورپ، اور مغربی وسط ایشیا جہاں سے آریا

آئے تھے، وہاں اور بھی بہت سے آریا باقی رہ گئے تھے۔ برفانی زمانوں کے بعد کرۂ زمین کا موسم تدریجاً گرم ہوتا جاتا تھا۔ پہلے تو سرد اور بنجر میدان تھے، جیسے کہ اب بھی سائبیریا میں موجود ہیں۔ پھر اس کے بعد شدید بارش کا عہد آیا۔ اور اس سے جنگل اُگ گئے۔ پھر زمین خشک ہونے لگی اور گرمی کا عمل شروع ہوا۔ جنگل رفتہ رفتہ کم ہوتے گئے اور ان کی جگہ بڑے بڑے سبزہ زاروں نے لے لی۔ یہ بھی روز بہ روز خشک ہوتے گئے اور اس طرح گھاس بھی کم سے کم اُگنے لگی۔ ان خطوں میں رہنے والے قبیلوں کا دار و مدار صرف مویشی پر تھا اور گھاس کے بغیر انھیں کوئی چارہ نہ تھا۔ چناں چہ ادھر تو وہ آریا جو مغرب اور جنوب میں ترکِ وطن کر گئے تھے، مغربی اور جنوبی یورپ اور جنوبی ایشیا کی زرخیز اور سیر حاصل زمینوں میں ایک متمدن زندگی اختیار کر رہے تھے۔ ادھر وہ آریا جو پیچھے رہ گئے تھے، اپنے جانوروں کے لیے چارے کی تلاش میں مسلسل بادیہ پیمائی یا خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ لوگ چمڑے کے خیموں یا بعض اوقات بڑی بڑی گاڑیوں میں رہتے تھے۔ ان گاڑیوں کو وہ اپنا اسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ ان میں سے بہتوں کی گزر بسر تقریباً تمام تر گھوڑیوں کے دودھ پر ہوتی تھی۔ جوں جوں آب و ہوا خشک سے خشک تر ہوتی گئی، خانہ بدوش قبائل کی بادیہ پیمائی بھی زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے ان کی اور ان کے مویشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا رسد بھی گھٹنے لگی حالاں کہ تنزل پذیر رسد کے لیے زیادہ سے زیادہ مانگ تھی۔ یہ تنازع بقا اور بقا کے اس عمل کی صرف ایک مثال ہے جو آغازِ حیات سے کارفرما ہے۔ ماقبل انسان موٗرثوں کے ارتقا میں ان گنت زمانوں قبل جس طرح پیش آیا تھا، میدانی

قبیلے غذا کی گھٹتی ہوئی رسد اور بعد میں دشمنوں کے دباؤ کی وجہ سے نئی سمت میں پناہ کی جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ یہاں مشرقی منگولی قبیلے اپنا بے رحمانہ دباؤ ڈال رہے تھے۔ اس طرح انھوں نے تاریخ کی رفتار پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہزاروں سال تک ہم شمالی اور مشرقی یورپ اور مغربی وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں میں مغرب اور جنوب کی فتح و تسخیر میں اپنے بھائیوں کی پیروی کرنے کا میلان پاتے ہیں۔

پہلے پہل تو یہ سب حملہ آور آریا تھے مگر کچھ عرصے بعد شمالی مشرقی منگولیوں نے آریاؤں کو پیچھے کی طرف ڈھکیلنا شروع کر دیا۔ یہ منگولی خانہ بدوش انھی اسباب کی بنا پر آگے بڑھنے پر مجبور ہوئے تھے، جنھوں نے آریاؤں کو بے وطن کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ چین میں ایک زبردست اور متمدن حکومت تشکیل پا چکی تھی۔ اس طرح مختلف وقتوں میں ہن، ترک، مغل اور بہت سے دوسرے منگولی قبیلے آریاؤں کے نقشِ قدم پر چل کر جنھیں وہ اپنے آگے سے ڈھکیل رہے تھے، مغرب اور جنوب پر حملہ آوروں کی حیثیت سے نمودار ہوتے رہے۔

اس طرح وسط ایشیا کا بنجر ہو جانا دنیا کی تاریخ میں ایک زبردست اہمیت رکھنے والا واقعہ تھا۔ اس کے بڑے بڑے میدانوں میں دو نہ ختم ہونے والی جفاکش قومیں یعنی منگول اور آریا پرورش پاتی تھیں۔ ان کے ترکِ وطن نے دوسرے ملکوں اور ان کی آبادیوں کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔

تمدن کی ابتدا[1]

اب ہم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ غالباً آریاؤں کی پہلی مرتبہ جنوب اور مغرب میں نقل و حرکت سے بہت

---

[1] تہذیب اور تمدن کے حدود پر آیندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

دنوں پہلے جنوبی قفقازی نسل نے بہت سے مختلف خطّوں میں اعلا درجے کا تمدّن حاصل کر لیا تھا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آریا ہی وہ پہلے وحشی غارت گر تھے جنھوں نے قدیم تمدّن کو برباد کر دیا۔

بنی نوعِ انسان نے پہلے پہل مصر اور عراق میں حقیقی تہذیب حاصل کی۔ یعنی قوت کی تنظیم کی، دولت جمع کی، علم کو مدوّن کیا اور فنون میں مہارت پیدا کی۔ ان ملکوں کی بے انتہا زرخیز اور سرسبز و شاداب زمینیں دجلہ، فرات اور نیل سے سیراب ہوتی تھیں۔ یہ زمینیں تھوڑی سی محنت سے ایک کثیر آبادی کی دوامی پرورش کا سامان مہیا کر سکتی تھیں۔

عراق دجلہ اور فرات کے زیریں حصّے میں جہاں گیہوں خود رو اُگتے تھے، دُنیا کے پہلے حقیقی شہر وجود میں آئے۔ یہاں نہریں بنائی گئیں اور زراعت کو کافی ترقی دی گئی۔ بڑے بڑے معبد تعمیر کیے گئے، اعلا پیمانے پر آسودگی حاصل کی گئی اور آخر میں ایک بڑی سلطنت پیدا ہوئی جو پورے عراق پر حاوی تھی۔ یہ سلطنت سامری سلطنت کہلاتی ہے اور پانچ اور چھ ہزار سال قبل مسیح کے درمیان کسی زمانے میں موجود تھی۔ غالباً سامری پہلے لوگ تھے جنھوں نے تحریر کو ترقی دی۔ ایک طویل عرصے تک یہ تحریر بہت ہی بھدی اور بے ڈھنگی سی رہی۔ اس کی ایک اصلاح شدہ صورت وحشی مصور تحریریں ہیں جو اب تک غیر متمدّن قوموں میں پائی جاتی ہیں۔ ان تحریروں میں ایسی چیزوں کی بھدی تصویریں بنائی جاتی تھیں جن کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس سامری سلطنت کو خانہ بدوش سامی عربوں نے (یہ آریا نہیں تھے) فتح کر لیا۔ یکے بعد دیگرے یہ موج در موج آتے گئے، پہلے حملہ آور عکادی کہلاتے تھے۔ عکادیوں کے بعد آشوری اور ان کے بعد کلدانی آئے۔ ان حملہ آوروں نے خود

بھی اپنی مستحکم سلطنتیں قائم کیں اور طاقت ور مرکزی حکومت اور بڑی بڑی فوجوں کے ذریعے ان کی مدافعت اور توسیع کیا کرتے تھے۔ چناں چہ یہ بات واضح ہو کہ انسانی معاشرے نے بہت بڑی حد تک ترقی کر لی تھی۔ لوگوں نے وسیع ترین جماعتوں میں متحد ہونا سیکھ لیا تھا۔ عراق میں آریاؤں کے پیش روؤں کے نمودار ہونے سے ہزاروں سال پہلے یقیناً خانہ بدوش قبیلوں اور شکاری گروہوں کا دور قطعی طور پر ختم ہو چکا تھا۔ آخر کار ۵۲۹ ق م میں ان آریاؤں (اور ایرانیوں) نے کلدانی حکومت کو تباہ کر دیا اور خود اپنی یعنی ایرانی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

آریاؤں سے پہلے ساھری سلطنت کی بنا سے لے کر کلدانی سلطنت کے زوال تک تقریباً پانچ ہزار سال کے دوران میں اس سرسبز و شاداب اور آسودہ و خوش حال خطے میں اعلا درجے کا تمدن حاصل کر لیا گیا تھا۔ لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور اسے گاڑی کے پہیوں میں لگایا جاتا تھا۔ دور دور تک تجارت ترقی کر گئی تھی۔ عالی شان محلات اور شہر پیدا ہو چکے تھے۔ ان کی تزئین و آرائش بہترین مجسموں سے کی گئی تھی۔ ایک حد تک ادب بھی پیدا ہو گیا تھا، اگرچہ بھونڈی طرزِ تحریر اور لکھائی کے سامان کے فقدان کی وجہ سے اس میں بہت سی رکاوٹیں تھیں[۱۹]۔

مصر | اس اثنا میں کچھ اسی طرز کا تمدن مصر میں عروج پر تھا۔ اس تمدن کے آثار کے تحفظ میں خشک آب و ہوا نے نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ مقبرے اور معابد جن میں یہ آثار پائے جاتے ہیں وادیٔ نیل کے

---

[۱۹] ساھری رسم خط نے ایک بھدی قسم کے مصور رسم خط سے ترقی پائی تھی۔ پہلے پہل پتھر پر لکھی جاتی تھی، پھر مٹی کی تختیوں پر لکھی جانے لگی۔ اس کے لکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی نوک دار آلے سے نرم مٹی پر میخی وضع کی سیدھی لکیریں کھینچی جاتی تھیں اس وجہ سے اس گروہ سے تعلق رکھنے والے خطوط کو "میخی" کہا جاتا ہے۔

بالائی اور زیریں حصے میں کثیر تعداد میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ نیل وہ عظیم الشان دریا ہے جس کا سالانہ سیلاب مصر میں بارش کے بدل کا کام دیتا ہے اور دونوں کناروں پر کی زمین کی پٹیوں کو غیر معمولی طور پر سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے۔ قدیم ترین مقبروں کی جانچ کرنے سے ایسے لوگوں کا پتا چلتا ہے جو ابھی وحشی ہی تھے۔ اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے دوستوں کی لاشوں کے بعض حصے کھانے کے عادی تھے۔ لیکن پانچ ہزار سال قبل مسیح کے قریب مصری پتھر سے کام لے رہے تھے، کانسی کا استعمال جانتے تھے اور اسی عہد کے سامریوں سے بالکل مختلف لیکن اتنی ہی اچھی مصور تحریر کا استعمال کر رہے تھے۔

بے انتہا سرسبز و شاداب ہونے کے باوجود مصر اپنے ملک کی سرحدوں پر وسیع ریگستانوں کے واقع ہونے کی وجہ سے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھا۔ اس طرح اس کی تہذیب بغیر کسی خلل کے ترقی کر سکتی تھی۔ پیاپیرس کا غذ جو لکھنے کے کام آتا تھا، اس کی بے شمار برکتوں کی وجہ سے اس کی ترقی میں بڑی مدد ملی۔ مصریوں نے مختلف سمتوں میں اور خاص کر فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ عظیم الشان عمارتیں خصوصاً عبادت گاہیں اور مقبرے تعمیر ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور حیرت انگیز جیزہ کے اہرام ہیں جن کا زمانہ ۲۷۰۰ سال قبل مسیح سے بھی پہلے کا ہے۔ عراق کی طرح مصریوں نے بھی ایک بہترین طرز کی مجسمہ سازی کو ترقی دی۔ انھوں نے نہایت چابک دستی سے خوب صورت تصویریں بنائیں۔ یہ ایک مکمل مذہبی نظام رکھتے تھے، جس میں بہت سے دیوتاؤں کی پرستش شامل تھی۔ ان دیوتاؤں میں بعض قبائلی معبود تھے اور بعض قدرتی مظاہر (جیسے خدائے شمس) ان میں سے بہتوں کو انسان یا حیوان کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے مختلف علوم

خاص طور پر علم ہیئت میں بڑی ترقی کی تھی ۔

مختلف زمانوں میں مصری سلطنت عرب اور عراق کے حملے سہتی رہی اور پھر اس نے انھی سمتوں میں وسعت اور فتوحات حاصل کیں ۔ یہ فتوحات مشہور یونانی فاتح سکندر اعظم کے زمانے تک جاری رہیں ۔ اس فاتح نے مصر کو زیر کرکے اسے اپنی یونانی سلطنت کا ایک حصّہ بنا لیا ۔

کریٹ

ایک تیسری قسم کے تمدّن کو غالباً اسی زمانے میں جب کہ مصر اور عراق کا تمدّن عروج پر تھا ، بحرِ روم کے جزیرۂ کریٹ میں عروج حاصل ہوا ۔ یہ منی آنی[۱] تمدّن کہلاتا ہے ۔ یہ تمدّن یونان ، اطالیہ اور بحرِ روم کے دوسرے ملکوں میں پھیل گیا ۔ تجارتی اور بحری تمدّن ہونے کی وجہ سے یہ مصر اور عراق کے تمدّنوں سے مختلف تھا ، جن کی بنیاد زرخیز دریائی وادیوں میں رکھی گئی تھی ۔ ۳۵۰۰ سال قبل مسیح سے پہلے ہی اہلِ کریٹ مشّاق ملاح اور تاجر تھے ۔ اس کے بعد ترقی کے طویل اور پُرامن دور میں انھوں نے ایک اعلا فن کاری اور فنِ تعمیر کو نشوونما دی ۔ ان کی کوزہ گری ، پارچہ بافی ، بُت تراشی ، مصوری اور اس کے ساتھ جواہرات ، ہاتھی دانت اور دھاتوں پر ان کے کام ایسے ہی لائقِ تحسین ہیں جیسے کہ کسی بھی عہد میں انسان نے انجام دیے ۔

گزشتہ چند سالوں کے دوران میں بڑے بڑے محلوں کے بعض کھنڈروں کا پتا چلایا گیا ہے اور احتیاط کے ساتھ ان کی کھدائی کی گئی ہے ۔ ان محلوں کو منی آن بادشاہوں اور امیروں نے تعمیر کیا تھا ۔ یہ عمارتیں نہایت شان دار ، پُرشکوہ ، پیچیدہ اور پُرتکلف تھیں ۔ ان میں پانی کے نل ، حمام اور ایسی ہی

---

[۱] یہ نام کریٹ کے روایتی بادشاہ منا س سے لیا گیا ہے ۔

بہت سی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔ آرام و آسایش کے نقطۂ نظر سے یہ اتنے قابلِ تعریف ہیں کہ قدیم دُنیا میں یہ باتیں کسی سے مہیا نہ ہو سکیں۔ ۔۔۔ ۱ سال قبل مسیح سے کچھ پہلے اس کریٹ سلطنت کو حملہ آور آریاؤں نے فتح کر کے بہت بڑی حد تک تباہ و برباد کر دیا۔ یہ حملہ آور آریا غالباً ہلینی یا یونانی تھے۔

فنیقی منی آن حکومت کے پورے زوال سے بہت عرصے پہلے ایک دوسری تجارتی اور بحری قوم نے بحیرۂ روم کے خطے میں سربلندی حاصل کر لی تھی۔ یہ فنیقی جنوبی قفقازی نسل کی سامی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدا میں یہ عرب سے خانہ بدوش حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے تھے اور شام کے ساحل پر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں ان کا سب سے اہم شہر ٹائیر واقع تھا۔ یہ شہر سمندر پار کی تجارت کا بہت شان دار مرکز بن گیا تھا کیوں کہ فنیقی بہت اچھے ملاح اور تاجر تھے۔ انھوں نے بحیرۂ روم کے ساحلوں اور جبل الطارق کے پار تک متعدد منڈیاں قائم کی تھیں۔ ان تجارتی منڈیوں میں سے بعض منڈیاں ترقی پا کر اہم ریاستیں بن گئی تھیں۔ ایسی ریاستوں میں قرطاجنہ کی فنیقی نو آبادی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سنہ ۸۰۰ قبل مسیح میں یہ ایک زبردست بحری سلطنت تھی۔ اس کے جہاز بہت دُور دُور تک ساحلوں اور شمال میں انگلستان تک جاتے اور تجارت کیا کرتے تھے۔ قرطاجنہ ایک بڑا صنعتی مرکز بھی تھا، ان کی صنعت خوب چمکی ہوئی تھی، خصوصاً پارچہ بافی کی صنعت کو یہاں بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ اس نے اسپین میں کانیں کھُدوائیں اور افریقہ کے صحرائے اعظم کے پار تک وسطی افریقہ کی وحشی قوموں سے تجارت کی ہے۔

کہا جاتا ہے ایک مرتبہ فنیقی ملاح خلیج سوئز سے شروع کر کے پورے

افریقہ کے گرد گھوم گئے تھے۔ اس قسم کے بحری سفر میں اُن کے تین سال صرف ہوئے۔ اپنی گزران کے لیے وہ ہر سال کسی مقام پر اُتر پڑتے تھے، پھر گیہوں کی کاشت کرتے اور اس وقت تک ٹھیرے رہتے جب تک کہ فصل پک کر کاٹنے کے قابل نہ ہو جاتی۔ غالباً فنیقی ہندستان اور سیلون سے بھی مستقل طور پر تجارت کیا کرتے تھے۔

حروفِ تہجی کے ذریعے لکھنے کی بیش بہا ایجاد کے لیے ہم ابھی فنیقوں کے زیر بارِ منت ہیں۔ ابتدائی قسم کی تحریروں کی طرح اس میں تحریری علامتیں اشیا کی تصویریں یا ان کے خاکے نہیں ہوتے تھے، بلکہ یہ تحریری علامتیں معمولی بات چیت کی صوتیات کے مطابق ہوتی تھیں۔

یہودی

یہودی قوم فنیقوں کی ایک دوسری رشتے دار قوم تھی۔ اصلاً یہ بھی عرب کے خانہ بدوش تھے۔ یہاں سے انھوں نے پہلے عراق کو ہجرت کی اور پھر وہاں سے مصر اور آخر میں فلسطین پہنچے۔ ولادتِ مسیح سے بارہ سو سال پہلے یہ فلسطین میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ یہودی ایک چھوٹی سی قوم پر مشتمل تھے اور شروع ہی سے ان کی جماعت عجیب سی تھی۔ اس قوم کے ہمسایہ مصر اور عراق تھے۔ یہ بدنصیب قوم ان دونوں کے بیچ میں واقع تھی۔ مصر اور عراق کی عظیم الشان سلطنتوں نے اس کو بار بار زیر کیا ہے۔ نویں صدی قبل مسیح میں صرف ایک مختصر زمانے کے لیے یہودیوں کو فوجی قوت اور مادّی عظمت ضرور حاصل ہو گئی تھی۔ یہ باتیں انھیں داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے دو طاقت ور بادشاہوں کے تحت حاصل ہوئی تھیں۔ خوش حالی کے اس مختصر زمانے کے بعد یہودی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے اور کچھ زمانے بعد آشوریوں اور کلدانیوں نے انھیں آسانی سے ختم کر دیا۔ لوگ

غلام بنائے گئے اور ان کی بڑی تعداد کو قید کر کے عراق اور اس سے بھی آگے لے گئے ۔

جیسا کہ ہم اس کے بعد دیکھیں گے یہودیوں کا تمدن ان عظیم الشان سلطنتوں کے مقابلے میں کم زور ہونے کے باوجود بے حد اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ اہمیت مادّی کارناموں کے لیے نہیں بلکہ ان عظیم اخلاقی اور مذہبی تصورات کے لیے ہے جو اس چھوٹی سی قوم میں پیدا ہوئے ۔ یہ عظمت ان پیغمبرانِ عظام کے لیے ہے جنھوں نے ان تصورات کی تبلیغ کی تھی ۔

چین

اسی دوران میں یہاں سے بہت دور ایشیا کی دوسری جانب چین میں آباد شدہ منگولی قوموں میں ایک دوسری طرز کا تمدن نشوونما پارہا تھا ۔ یہ تمدن جنوبی قفقازی قوموں میں نشوونما یافتہ ان تمدنوں سے بالکل مختلف تھا جن کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے ۔

عراق اور مصر کی طرح چین میں بھی سرسبز و شاداب دریائی وادیوں نے انسان کو توطن پذیر زندگی کی دعوت دی اور آبادکاروں کو آسودگی اور ترقی کے سامان مہیا کیے ۔ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کے قریب ایک زبردست چینی سلطنت قائم ہو چکی تھی ۔ کانسی دریافت کر لی گئی تھی اور اس پر نفیس کام کیا جاتا تھا ۔ ۵۰۰ ق ۔ م کے قریب لوہا عام ہو گیا اور ۲۰۰ ق ۔ م میں چینی تہذیب اور تنظیم خانہ بدوش منگولی قبیلوں کو سلطنت کی سرحد کے باہر ڈھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی ۔ اس کو ایک زبردست مرکزی حکومت اور طاقتور فوجوں کی حمایت حاصل تھی ۔

اس زمانے سے بہت پہلے ہی سے چینیوں نے ایک مکمل مصور طرزِ تحریر کو ترقی دی تھی ۔ اس کو دوام نصیب ہوا اور اب تک بھی یہ نہایت

بھاری شکل میں باقی ہے۔ ادب کا بھی کافی وسیع ذخیرہ پیدا ہوگیا تھا، اس کا بیش تر حصّہ حسن وخوبی اور حکمت سے مملو ہے۔ بڑی بڑی نہریں اور نفیس عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ سلطنت کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ گئی تھی۔ یہاں ایک مستقل اور مرفّہ الحال سماجی نظام نے ترقی پائی جو اب تک باقی چلا آتا ہے۔ سلطنت جس وسیع ملک پر پھیلی ہوئی تھی، اس کا نظم ونسق نہایت باقاعدہ طور پر کیا گیا تھا۔

خاتمہ اس طرح ہم نے اپنی نسل کے عروج کے ایک نہایت ہی مختصر سے جائزے کو زندگی کی ابتدا سے شروع کیا۔ اب ہم ما قبل انسان کے طویل زمانوں کے ارتقا اور قبل تاریخ کی بربریت سے گزر کر اس حد تک پہنچے ہیں، جہاں ایک وسیع تمدن زمین کے دو جُداگانہ علاقوں میں حاصل کیا گیا۔ یہ رقبے عراق، بحرِ روم اور چین کے علاقے ہیں۔ اس طرح ہم نے اپنے مختصر سے جائزے کو مکمل کر دیا۔

ہم نے دیکھا کہ بنی نوعِ انسان کی تاریخ کے سب سے طویل دور تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں۔ اسی تاریکی میں جہاں ہم انسان کو دھندلے طور پر حیوانوں سے فاقہ کشی اور دشمن قبیلوں سے دائمی طور پر معرکہ آرا دیکھتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح برفانی زمانوں کے بعد رفتہ رفتہ زمین کی آب وہوا کے گرم ہونے کے ساتھ ساتھ جدید حجری عہد کے انسان نے واضح طور پر ترقی شروع کر دی۔ کس طرح ان انسانوں کی مختلف نسلوں میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ کس طرح شمالی قفقازی یا آریا ان کی زمینوں کے خشک ہو جانے کے بعد جنگلوں اور میدانوں میں بڑھتی ہوئی خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے پر آہستہ آہستہ مجبور ہو گئے۔ کس طرح آخر کار وہ بڑی بڑی حملہ آور موجوں کی صورت میں

زیادہ زرخیز ملکوں کو ترک وطن کر گئے۔ یہ وہ ملک تھے جہاں جنوبی تفقازی پہلے سے تہذیب و تمدن کے مختلف مرکزوں کو بہت بڑی حد تک ترقی دے چکے تھے۔ ہم نے اختصار کے ساتھ قدیم تہذیبوں پر ایک اجمالی نظر ڈالی۔ یہ تہذیبیں پہلے سرسبز و شاداب دریائی وادیوں میں اور اس کے بعد بحر روم کے اطراف جمع ہوئیں۔ یہ تمدن بعد میں ایسی وسیع سلطنتوں کی صورت میں پھیلے جن کی بنیاد یا تو بڑی قوت اور فتح مندی پر یا بحری قوت اور تجارت پر رکھی گئی تھی۔ آخر میں ہم نے نہایت نمایاں چینی تمدن کے مختلف اور انفرادی ارتقا کا مطالعہ کیا۔

دوسرا باب

تہذیب کا مفہوم۔ ہندستان اور چین

تہذیب کیا ہے؟ جیسے جیسے ہم بنی نوعِ انسان کی گزشتہ دو تین ہزار سالہ تاریخ کا زیادہ تفصیلی مطالعہ کرتے جاتے ہیں، ہم خاص طور پر ایسے ملکوں میں تمدنی ترقی کا رجحان زیادہ پاتے ہیں جہاں آریا نسل اس سے زیادہ متمدن جنوبی قفقازی قوموں سے دوچار ہوئی تھی۔ یہ آریا نسل ابھی تک کم و بیش خانہ بدوشانہ حالت میں ہی تھی۔ اس سلسلے میں چین ایک استثنائی مثال ہے، اور اس کے لیے ایک جداگانہ بحث کی ضرورت ہے، مگر ہم کو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حقیقی تہذیب کی علامتیں کیا ہیں؟

خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ تہذیب اور قدیم بربریت یا محض مادّی تمدن میں امتیاز کرنا ہو، یہ اور بھی ضروری ہے۔

انسان نے اپنے ماقبل انسان مورثوں سے بہت سی جبلتیں[1] ورثے میں پائی ہیں۔ یہ جبلتیں اب تک افراد اور جماعتوں کی زندگی اور سرگرمی میں پوشیدہ ہیں، اگرچہ انھیں ان کے اثر کا شعور نہیں۔ ایسی جبلتیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ موت سے بچے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی سعی کرے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ بچوں کی پرورش کے ذریعے نسل کو برقرار رکھے۔ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ہر اس چیز کی مدافعت کرے جو اس کی یا اس کے بچوں اور دوستوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈالے۔ یہ انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ باہم مل کر خاندان، قبیلہ اور قوم کی صورت اختیار کرے تاکہ بہتر سے بہتر طریقے پر تحفظِ ذات اور آسودگی حاصل ہو سکے۔

اس طرح تہذیب کا عمل ان زبردست قدیم جبلتوں اور ان سے پیدا ہونے والی ساری سرگرمیوں کی آزاد، ارادی اور رضامندانہ اطاعت میں مضمر ہے۔ یہ سرگرمیاں وسیع سے وسیع تر انسانی جماعتوں اور آخرکار بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح تہذیب ایک روحانی چیز ہے، جس میں آزاد وارادی خدمت گزاری اور اطاعت پذیری شامل ہے۔ اس کے برخلاف تمدن یکسر مادّی اور خود غرضانہ ہو سکتا ہے۔ کثیر دولت، ناقابل مقاومت قوت اور وسیع علم کا مظاہرہ کرنے کے باوجود بھی یہ آزادی اور خدمت گزاری

[1] جبلتیں ایسے فطری یا موروثی میلانات ہیں جو تمام فکر و عمل کے مبداء اور محرک ہوتی ہیں خواہ یہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، یہ ایسی بنیادیں ہیں جن پر افراد اور قوم کا کردار تدریجی طور پر تعمیر ہوتا ہے۔ ("سماجی نفسیات" صفحہ ۱۹، مصنفہ مکڈانلڈ)

کی روح سے عاری ہو سکتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود تہذیب، تمدن کا ایک خاص درجہ حاصل کیے بغیر مشکل سے برقرار رہ سکتی ہے۔ تمدن کے بغیر علم اور ذرائع حمل و نقل حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانیت کی ہمہ گیر اور فیاضانہ خدمت کے لیے ناگزیر ہیں۔

درندوں میں یہ جبلتیں عموماً بے روک ٹوک کام کرتی ہیں۔ شیر اپنی ضرورت کے مطابق شکار کرتا ہے اور اپنے دشمنوں سے دوچار ہونے پر ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ شیرنی امکانی حد تک بچوں کی غور و پرداخت کرتی ہے۔ یہ تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن بہت سے درندے جیسے بھیڑیے غول بنا کر رہتے ہیں اور اس طرح اپنی اور اپنے بچوں کی بہتر طریقے پر حفاظت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ غذا کے لیے انھیں بہتر مواقع ملتے ہیں اور مقابلے کے لیے زیادہ قوت پیدا کرتے ہیں۔ عموماً ایسے غول کی رہنمائی سب سے زیادہ مضبوط نر کیا کرتا ہے۔ کسی زمانے میں ابتدائی انسان بھی گروہ یا غول کی صورت میں رہتا تھا۔ اس گروہ کی قیادت ان میں کا سب سے زبردست مرد کیا کرتا تھا۔ اس قسم کی غولی زندگی بجائے خود بے لگام جبلتوں پر ایک روک ہے۔ یا کم از کم قدیم جبلتیں زیادہ ترقی یافتہ جبلتوں کی تابع ہو جاتی ہیں۔ شدید بھوک کی اضطراری حالت میں سوا افراد ایک دوسرے کو مار کر نہیں کھاتے۔ غول میں لڑائیوں اور خاص کر ایسی لڑائیوں کی سرقائد عموماً ہمت افزائی نہیں کرتا جس میں موت واقع ہو۔ وہ اور دوسرے طریقوں سے بھی اپنے ساتھیوں میں ان جبلتوں کے ابھرنے سے روکتا رہتا ہے۔ غولی زندگی سے ہٹ کر بھی بہت سے درندوں میں گھریلو زندگی کی نمایاں علامتیں پائی جاتی ہیں۔ چناں چہ بچوں کی پرورش میں نر، مادہ کی مدد کیا کرتا ہے۔

بنی نوعِ انسان کی تاریخ دراصل اس عمل کی تاریخ ہے جس میں بڑے سے بڑے غول یا گروہ بنے اور جس میں مسلسل بڑھنے والی جماعتوں کے مفاد اور جماعتوں کے افراد اور خاندانوں کے مفاد کے درمیان صحیح توازن دریافت کیا گیا۔ حقیقی آزادی تہذیب کا مکمل ثمرہ ہے۔ اس کی ترقی ہی اپنے اعلا مفہوم میں تاریخ کا موضوعِ بحث بنتی ہے۔ تہذیب وہ حالت ہے جس میں ہر فرد اپنی تمام جبلتوں اور سرگرمیوں کو ارادتاً خدمتِ خلق کے لیے وقف کرکے ہی کُل بنی نوعِ انسان کی بہترین خدمت انجام دے سکتا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ قدیم قومیں جن کا مختصر سا ذکر ہم کر چکے ہیں، آزادی اور خدمت کے اعلا معیار پر ایک حقیقی تہذیب کی بنیاد رکھنے میں بہت آگے نکل گئی ہوں۔ مصر، کریٹ، عراق، چین اور دوسرے مقامات پر بڑی بڑی انسانی جماعتیں ہزاروں سال سے ایسی زندگی بسر کر رہی تھیں جو تمام تر پُرامن، متحد، آسودہ اور منظم تھی۔ اس کے معنی یہ ہوے کہ ان قدیم سلطنتوں میں آزادی اور خدمت کے تصورات کو کسی حد تک محسوس ضرور کر لیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ قومیں فنِ تحریر سے پوری طرح واقف نہ تھیں، اس لیے اس بارے میں ان کی کامیابیوں کے متعلق ہماری معلومات نہایت ناقص ہیں۔ ہم اِدھر اُدھر سے ان کی حقیقی زندگی کی صرف جھلک ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی مادّی فتوحات یعنی ان کے مقابر، محلات، معابد اور ایسی ہی دوسری چیزیں گو حیرت انگیز ضرور ہیں، تاہم یہ چیزیں حقیقی تہذیب کی طرف ان کی پیش قدمی کا پتا چلانے کے لیے صحیح رہبر کا کام نہیں دے سکتیں، کیوں کہ تمدن کی ایسی علامتیں خارجی اور مادّی ہیں۔ اس کے برخلاف جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، تہذیب داخلی اور رُوحانی چیز ہے اور اس کا انحصار آزادی اور خدمت کے

تصورات کے ادراک پر ہے۔

بہرحال یہ جماعتیں اور سلطنتیں نسبتاً جدا جدا اور منتشر تھیں۔ ان کی مثال وحشت اور بربریت کے وسیع ریگ زاروں میں نخلستانوں کی سی ہے۔ تاریخ کے اس ابتدائی دور میں انسان کے لیے بنی نوع کی خدمت کرنا یا اس کو بہ طور ایک کل کے تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

آریا متوطن

آریاؤں کی آمد اور تحریر کے بہتر طریقوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ منظر بدلنے لگتا ہے۔ بنی نوع انسان کی حقیقی تہذیب اور آزادی کی جانب ترقی کا اندازہ لگانا اور یہ معلوم کرنا کہ بڑی بڑی قوموں اور عظیم شخصیتوں نے اس ترقی میں کیا حصہ لیا ہے اب نسبتاً زیادہ آسان ہے۔

حملہ آور آریاؤں نے غالباً لڑائی میں مدافعت کے لیے اپنی پہلی نوآبادیاں بسائیں۔ یہ محض بھدے سے حصار تھے، ان کے اندر خطرے کے وقت قبیلے جمع کیا جا سکتا تھا اور ان کے اطراف وسیع سے وسیع تر پیمانے پر زراعت کی جا سکتی تھی۔ اس طرح جہاں زمین زرخیز تھی اور نوآبادی کے اطراف میں گھاس کی بہتات تھی، وہاں آباد کار دیہاتی زندگی نے وسط ایشیا کی خانہ بدوشانہ زندگی کی جگہ لے لی۔

جیسا کہ غولی عہد میں سب سے زیادہ زبردست نر غول کی قیادت کرتا تھا، اسی طرح قبیلوں کی قیادت قبیلے کے سرداروں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ سردار قبیلے کی اطاعت قبیلے کے صدر اور قبائلی روح کے نمائندے کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ قبیلے کے افراد اس کے اور قبیلے کے لیے لڑ کر خوشی سے جان دے دیتے تھے۔ مگر سردار کسی معنی میں بھی خود مختار بادشاہ نہیں ہوتا تھا۔ غالباً اس کا انتخاب ہوا کرتا تھا۔ اور اسے بڑی حد تک بڑے بوڑھوں

کی بھدی سی مجلسِ شوریٰ پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ یہ مجلس قبیلے میں شامل خاندانوں
کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ امن اور جنگ ہر زمانے میں وہ انھی لوگوں
میں گھرا رہتا تھا جو اس کے دوست اور ساتھی ہوتے تھے۔ یہ لوگ اس کے
ماتحت نہیں، بلکہ اس کے ہم پایہ اور برابر کے ہوتے تھے۔ اس کی حیثیت
ان میں محض سب سے زیادہ بہادر، سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے
زیادہ معزز شخص کی سی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ کسی مشورے کی پروا نہ کرے
اور اپنے رتبے کو قبیلے میں من مانی حکومت کرنے کے لیے استعمال کرے تو
اس کو ضرور معزول کر کے اس کی جگہ کسی دوسرے کو منتخب کر لیا جائے گا۔

یورپ اور ایشیا کی تاریخ میں آریا قبیلوں کے نمودار ہوتے ہی سرداری
کا یہ قبائلی نظام بہت نمایاں ہو گیا۔ اس نظام پر خاندانوں کے صدر نگرانی رکھا
کرتے تھے۔ جب ان لوگوں نے مقیمانہ دیہاتی زندگی اختیار کر لی تو عام طور پر سردار
کی قوت میں اضافہ اور توارث کا رجحان پیدا ہونے لگا۔ اس طرح بہت بڑی
حد تک بڑے بوڑھوں کی مجلس کا اقتدار گھٹ گیا۔ بہر حال ان خود ساختہ
امیروں نے بڑھتے ہوئے اقتدار کی وجہ سے اپنا آپ نقصان کر لیا۔ یہ اقتدار
ان کو عام طور پر آباد کار زندگی نے خود انھی کے ماتحت خاندانوں کے افراد
اور مفتوحہ نسلوں کی باقیات پر عطا کیا تھا۔ ایسے لوگ جاگیروں میں رہتے تھے
اور یہ جاگیریں سردار کی طرف سے امیروں اور ان کے خاندانوں کو عطا ہوتی تھیں۔

زرخیز ملک میں ایک پُرامن زندگی بادشاہ کے اقتدار کو بڑھانے کا رجحان
رکھتی ہے۔ اسی طرح سردار پیدا ہوئے۔ سرداروں کے وجود میں آنے کے
خاص طور پر حسب ذیل اسباب ہوئے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگ میں بادشاہ
کا ساتھ دینے کے لیے خانہ بدوش سواروں کی بہ نسبت آسودہ حال کسان بہت

کم آمادہ ہوتے تھے۔ چناں چہ قبیلے اور مُلک کی حفاظت کے لیے فوجیں حاصل کرنے کے لیے اہلِ قبیلہ کو بذاتِ خود لڑنے کے لیے طلب کرنے کی بجائے بادشاہ ان پر ایک محصول عائد کرتا تھا۔ اس محصول سے حاصل شدہ رقم سے وہ سپاہیوں کو نوکر رکھ لیتا تھا۔ یہ کرائے کے سپاہی جنھیں بادشاہ کی طرف سے تنخواہ ملتی تھی قبائلی فوج کی بہ نسبت زیادہ مطیع اور زیادہ تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ بادشاہ ان کرائے کے سپاہیوں سے نہ صرف قبیلے کے لیے نئے مُلک فتح کرنے کا کام لیتا تھا، بلکہ انھیں خود قبیلے میں اپنے اقتدار کو مطلق بنانے میں استعمال کیا کرتا تھا۔ جلد یا بہ دیر یہ طریقۂ عمل تقریباً ان تمام مُلکوں میں جاری ہو گیا جہاں حملہ آور آریا مقیم ہو گئے تھے۔

آریا ہندستان میں

جب حملہ آور آریا غالباً ۱۲۰۰ سال قبل مسیح کے قریب ہندستان پہنچے تو یہاں انھیں ڈراوری قومیں ملیں۔ یہ قومیں پہلے سے اچھی طرح آباد تھیں اور تمدن میں بہت ترقی کر چکی تھیں۔ یہ ڈراوری غالباً ہزاروں سال قبل اس وقت مغرب سے یہاں آئے تھے جب کہ جنوبی قفقازی نسل مشرق کی طرف دُنیا کے اطراف میں پھیل رہی تھی۔ غالباً انھوں نے حبشی قبیلوں کو پہلے سے ہندستان پر قابض پایا ہوگا لیکن یہ پورا موضوع بہت ہی مبہم ہے۔

آریاؤں کا رنگ صاف تھا، جب یہ فاتح کی حیثیت سے اپنے سے زیادہ سیاہ فام ڈراوریوں میں بس گئے تو فاتح اور مفتوح میں رنگ کے اعتبار سے امتیاز کیا جانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ آریا آقا مانے جاتے تھے اور ڈراوڑی زیر ہو کر غلام سمجھے جاتے تھے۔ اس طرح ان نسلوں میں رنگ کی ایک حدِ فاصل پیدا ہو گئی۔

آریاؤں میں جماعتی نظام پہلے ہی سے پیدا ہو چکا تھا۔ ان میں یہ رواج پڑ گیا تھا کہ قبیلے کے لیے ہر شخص ایک خاص خدمت انجام دیا کرے۔ یہ خدمت حاکم کی حیثیت سے انجام دے یا امیر کی حیثیت سے، مذہبی پیشوائی کرے، یا کھیتی باڑی یا گلّے بانی، بہرحال خدمت ہر ایک کی متعین کر دی گئی تھی۔ ایک آباد اور پُر امن زندگی کے ساتھ ساتھ ان خدمتوں میں توارث کا رجحان پیدا ہو گیا۔ بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا جانشین ہو کر بادشاہ بننے لگا اور امیر کا بیٹا امیر بن جاتا تھا۔ ان لوگوں کا تعلق چھتری طبقے سے تھا۔ مذہبی پیشوا کا بیٹا مذہبی پیشوا ہو جاتا تھا اور اس طرح برہمنوں کا طبقہ وجود میں آیا۔ کسان کا بیٹا کسان ہی رہتا تھا اس طرح یہ عام لوگ ویش طبقے سے متعلق ہو گئے۔ رنگ کے اس امتیاز کے تحت مفتوح ڈراوڑی ادنا طبقے بن گئے۔ ان میں ہر شخص کا رجحان ایک مخصوص خدمت انجام دینے کی طرف تھا۔ یہی موروثی ذاتیں بن گئیں جن کے افراد اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لیتے تھے۔ ان سب کو ملا کر شودر کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ذات بندی کا یہ پورا نظام مذہب کی منظوری سے ایک وسیع فرقہ بند تنظیم کی صورت میں مستحکم کر دیا گیا۔ اس تنظیم میں ہر فرقے کی درمیانی حد کو اس طرح واضح اور قطعی کر دیا گیا جیسے اصلی سفید فام آزاد آریاؤں اور سیاہ فام غلام ڈراوڑیوں میں کیا گیا تھا۔ اس امتیازِ رنگ کے نام پر پورے نظام کا نام رکھا گیا کیوں کہ ہندستان کے فاتح آریاؤں کی زبان سنسکرت میں رنگ کے لیے جو لفظ ہے وہ "ذات" کے معنی بھی دیتا ہے۔

گو ذات بندی کے اس نظام نے اپنے آپ میں اس خدمت کے تصور کو جو فرد جماعت کے لیے انجام دیتا ہے مجسم کر لیا تھا، پھر بھی یہ نظام خدمت کو اختیاری اور آزاد بنانے میں ناکام رہا۔ اس نے انسان، انسان کے درمیان

سخت حدود قائم کر دیے اور ہندستان کی کثیر آبادی کے حق میں دائمی ذلت و خواری کا فتوا صادر کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ نظام پورے ملک کے طول و عرض اور راست جنوب میں ملک کی آخری حد تک پھیل گیا۔

گوتم بدھ غالباً سب سے زیادہ عظیم الشان ہستی جس نے ہندستان میں جنم لیا، وہ گوتم بدھ کی شخصیت تھی (پیدایش قریباً ۵۵۰ ق۔م) یہ ساکیا قبیلے کے ایک سردار کے بیٹے تھے۔ یہ قبیلہ شمالی ہندستان میں آباد ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ سنہ عیسوی کی ابتدا سے کوئی پانچ سو سال پہلے ہی وفات پا چکے تھے، لیکن ان کو اپنے ذاتی تصورات میں حقیقی آزادی اور حقیقی تہذیب کی یافت ہو چکی تھی۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو اور اپنی ہر اس جز کو جو ان کے قبضے میں تھی اپنی مرضی اور اختیار سے بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھیں ایسے ذریعوں کی تلاش تھی جن سے بنی نوع انسان کی زندگی تکلیف اور مصیبت سے نجات پا جائے۔ ان کی کوشش تھی کہ یہ ذرائع تمام ذاتوں، قبیلوں اور نسلوں کو ایک عہدِ اتحاد میں منسلک کر کے آپس میں ملا دیں۔ یہ ذریعۂ نجات اور عہدِ اتحاد انھوں نے احسان اور نفس کُشی کی نئی بشارت میں پایا۔ اسی عقیدے کی انھوں نے تلقین کی ہے۔ جن "حقائقِ جلیلہ" کا انھوں نے اعلان کیا، ان میں سے دو یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

"تکلیف اور مصیبت کی حقیقتِ جلیلہ" یہ ایک خواہش ہے جو اپنے آپ کو لذت اور جذبات میں شامل کرتی اور ہر وجود میں مسرت محسوس کر کے دوسرا جنم لینے کی محرک ہوتی ہے۔ یہ ایک خواہش ہے حسی لذت کے لیے، خواہش ہے بقائے دوام کے لیے، خواہش ہے عارضی وجود کے لیے۔

"مصیبت اور ابتلا کے استیصال کی حقیقتِ جلیلہ" یہ اس خواہش کا پوری

طرح دینا، معطل ہو جانا، ایک سپردگی، ایک بے اثری، ایک علیحدگی اور ایک بے تعلقی کا نام ہے۔[1]

خواہش کو مطیع کرنے کے عقیدے اور اس کے ساتھ ہر مخلوق کے ساتھ رحم و مہربانی کی تعلیم نے انسان میں تمام دُنیا کی خدمت کے لیے جبلّت کو اپنی مرضی سے مطیع کرنے کا تصور پیدا کیا۔

ذات پات کے خلاف بغاوت

گوتم بدھ کی ہمہ گیر تعلیمات پر ایمان لانا گویا فرقہ بندی کی ان حدوں کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ یہ حدیں وہ تھیں جو انسان انسان کے درمیان قائم کی گئی تھیں۔ اس اعتبار کے علاوہ اور اعتبارات سے ہندستان کی صحیح تاریخ ان عظیم تصورات کی تاریخ ہے جن کی ہندستان کے عظیم ترین فرزندوں نے تعلیم دی ہے، کیوں کہ ہندستان نے دُنیا پر جو گہرا اثر ڈالا ہے وہ ایک سیاسی اور عملی کا اثر نہیں بلکہ روحانی اثر ہے۔ گو ذات پات کی قید اب بھی باقی ہے اور اب بھی اس نے ہندستان کی کثیر آبادی کو سینکڑوں الگ الگ جماعتوں میں تقسیم کر رکھا ہے، تاہم صدیوں سے یہاں ایسے عظیم المرتبت ہادیوں کا سلسلہ بندھا رہا ہے جنھوں نے بتایا کہ خُدا کی نظر میں تمام انسان برابر برابر ہیں۔ ان ہی ہادیوں نے فرقہ بندی کی بجائے ایک وسیع کل کے ساتھ وفاداری کے تصور کو زندہ رکھا ہے۔

خود ہمارے زمانے میں ذات پات کے خلاف ہندستان میں بغاوت ہمیشہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اب یہ بغاوت اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ اس نے سماجی حلقے میں بھی ذات پات کے خلاف جنگ کرنے کو اپنے دائرۂ عمل

[1] فرکوہار کی کتاب "ہندستان کے مذہبی ادب کا خاکہ" صفحہ ۶۳ ۔

میں داخل کرلیا ہے۔ اس کا اظہار ایسی کوششوں سے ہوتا ہے جو مختلف ذاتوں کے افراد کے درمیان ہر قسم کے سماجی تعلقات کو بڑھانے کے لیے کی جارہی ہیں۔

خواہش کے خلاف جنگ

اس طرح ہندستان نے گوتم بدھ کی ان تعلیمات کو جو تمام بنی نوع انسان پر ایک احسانِ عظیم ہیں، کبھی نہیں بھلایا۔ ہندستان نے اس تعلیم کو بھی فراموش نہیں کیا جو مجاہدۂ نفس سے متعلق ہے۔ گو اس تعلیم کو گوتم بدھ کے وقت سے لے کر ہمارے زمانے تک ممتاز روحانی رہنماؤں کے ایک طویل سلسلے نے پُر زور طریقے پر سیکڑوں بار دہرایا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نفس کشی ہی ہندستان کے خاص مکاتیبِ خیال وادیان کا اصلِ اصول رہا ہے۔ انھوں نے واضح سے واضح طور پر بتایا کہ اگر انسان مرتبۂ ولایت و نجات حاصل کریں تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کی خدمت اور اپنی خود غرضانہ جبلّتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو ترک کردیں۔

تاریخِ ہند کے دوسرے رُخ

ہندستان کی روحانی فتوحات اور بعض مخصوص زمانوں کے سیاسی اتحاد کو چھوڑ کر ہندستان کی تاریخ خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی ایک طویل یادداشت ہے۔ بعض مخصوص زمانے جن میں اتحاد حاصل رہا، ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ ہیں جو بدھ شہنشاہ اشوک اعظم (۲۷۲-۲۳۱ ق-م) اور مسلمان شہنشاہ اکبرِ اعظم (۱۵۵۶ء - ۱۶۰۶ء) کے تحت گزرے ہیں جب ابتدائی آریا حملہ آور ایک مستحکم اور دائمی سیاسی تنظیم کے ساتھ آباد ہو گئے اور مادّی تمدن میں نمایاں حد تک ترقی ہوئی (اس کے ساتھ ساتھ وہ روحانی انکشافات بھی جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں) تو ایران، یونان اور وسطِ ایشیا کی طرف

سے آریاؤں کے تازہ حملے ہونے لگے۔ ان کے بعد یوہ شی (یاکشان) کے منگولوں اور ہُنوں کے حملے ہوئے۔ یہ مغرب اور جنوب کی طرف سے آریاؤں کا پیچھا کر رہے تھے۔ پھر ان کے بعد فاتح سامی عرب اور ترک افغانستان سے آئے۔ یہ اپنے ساتھ اپنا مذہب اسلام لیتے آئے۔ انھوں نے شمالی اور وسطی ہند میں یکے بعد دیگرے متعدد سلطنتیں قائم کیں۔ پھر ان کے بعد تازہ دم منگولی حملہ آور ترک اور مغل آئے۔ انھوں نے ایک زبردست اور عظیم الشان سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ آخر میں دورِ حاضرہ کے یورپی پہلے پہل تو تجارت کی غرض سے آئے اور بعد میں حکومت پر قابض ہو گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ملک میں جو بدنظمی اور انتشار پیدا ہوا وہ بتدریج ایک عظیم الشان برطانوی سلطنت کے عروج کا سبب بن گیا۔

گزشتہ صدی کے دوران میں ہندستان عالم گیر مغربی افکار و خیالات سے متاثر ہونے لگا۔ اس کے باشندوں نے مغربی طرز کی آزادی شدومد سے ساتھ طلب کرنی شروع کر دی ہے اور آج برطانوی عہدہ داروں کے ہاتھوں سے اقتداری مجالس قانونی کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ اگر یہ لوگ جو اس قوت کو استعمال کر رہے ہیں، عہدِ گزشتہ کے عظیم رُوحانی تصورات کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں تو اُمید ہے کہ ہندستان دُنیا کے آگے اس سے بھی کہیں اعلا اور عظیم الشان آزادی کی ایسی مثالیں پیش کر سکے گا جنھیں دُنیا نے اب تک کبھی نہیں دیکھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں شاعری، بُت تراشی اور سب سے بڑھ کر تعمیر کاری میں ہندستانی اعلا فن کارانہ ترقیوں کا مختصراً ذکر کرنا ضروری ہے۔ غالباً دُنیا کی سب سے زیادہ حسین و جمیل عمارت آگرے کا تاج محل ہے۔ اس کو

شہنشاہ شاہ جہاں (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء) نے اپنی محبوب ملکہ کے مقبرے کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ سائنس اور ریاضیات میں ہندوستان نے قدیم زمانوں ہی سے قابلِ لحاظ کام کیا ہے۔

چین کی تاریخ

مشرقِ بعید میں چینی تہذیب آریائی حملوں سے خلل انداز ہوئے بغیر پھیلتی پھولتی رہی۔ یہ حملہ آور اس قوم کے سوا ہر جگہ قدیم قوموں پر ہتھوڑے کی طرح شدت سے ضربوں پر ضربیں لگا رہے تھے۔ ان قدیم قوموں کا تمدن تمام تمدنوں میں پہلا حقیقی اور مستقل تمدن تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چین کے شمال میں وحشی خانہ بدوش ہن رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً سلطنت کے آباد ملکوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ ان ہنوں کو دور رکھنے کے لیے تیسری صدی قبل مسیح میں چین کی عظیم دیوار تعمیر کی گئی جو سرحد پر سمندر سے لے کر پہاڑوں کے بلند سلسلے تک چلی گئی ہے۔ لیکن آریاؤں کے برخلاف ہن آباد ہونے کے لیے کبھی نہیں آئے تھے۔ اگر چہ رفتہ رفتہ انھوں نے چینی تہذیب کا سطحی ہلکا رنگ اختیار کر لیا تھا، یہ صرف تباہ و برباد کرنا ہی جانتے تھے۔ آخرکار طاقتور ہان خاندان (تقریباً ۲۰۰ ق م سے ۲۰۰ بعد مسیح تک) کے تحت چین کی قوت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے ہنوں کو سیدھے مغرب کی طرف پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس کے بدلے میں ہنوں نے یہاں سے آریاؤں کو یورپ اور جنوب مغربی ایشیا کی طرف ڈھکیل دیا۔ پہلی منگولی نسل جو اس طرح ڈھکیل کر چین سے یورپ میں داخل کی گئی، یہ وحشی تھی۔ اس منگولی نسل نے ولادتِ مسیح سے تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے مشرقی اور مغربی ایشیا کو جدا کرنے والے عظیم الشان سلسلۂ کوہ کو پار کر کے مغربی ترکستان فتح کر لیا۔ اس کے بعد خود چین کی بڑھتی ہوئی قوت ان حدوں سے آگے نکل گئی۔ اس سے پہلے ہن اور منگولی

خانہ بدوش مغرب کی طرف مسلسل ہٹائے گئے۔ یہاں تک کہ منگولی ارمینیا میں رومیوں سے دوچار ہوئے۔ ایک زبردست چینی سپہ سالار بحیرۂ خزر تک جا پہنچا تھا، اور کچھ عرصے تک روما اور چین کی سلطنتوں کے درمیان صرف سمندر ہی حدِ فاصل تھا مگر اس کے بعد چینی سلطنت میں تنزل اور بدنظمی پیدا ہوگئی اور چینی اقتدار تیزی سے مشرقی جانب گھٹنے لگا۔

ساتویں صدی عیسوی میں ٹانگ خاندان کے تحت چینی سلطنت پھر بحیرۂ خزر تک وسیع ہوگئی اور ایک طویل عرصے تک مستقل طور پر مستحکم اور پرامن رہی۔ اس سلسلے میں سنگ منگ خاندان (جن کے زمانے میں چین پر خانہ بدوش تاتاریوں کا زبردست حملہ ہوا تھا) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور بڑے نام آور گزرے ہیں۔ آخر الذکر خاندان سترھویں صدی میں منچوری حملہ آوروں کے ہاتھوں ختم ہوگیا۔ یہ خاندان ہمارے زمانے میں جمہوریت قائم ہونے تک چین پر حکومت کرتا رہا ہے۔

چینی تہذیب کی حدیں بھونڈی اور مشکل چینی طرزِ تحریر تعلیم کی اشاعت میں خطرناک طور پر مانع ہوئی۔ اس نے سیاسی اقتدار کو ایک چھوٹی سی متمول اور حصولِ علم کے لیے کافی فرصت رکھنے والی جماعت کے ہاتھوں میں محدود کردیا۔ تاہم اس تکلیف دہ رکاوٹ کے باوجود چین والوں نے فنونِ لطیفہ اور علم و حکمت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ انھوں نے نہایت وسیع اور منفعت بخش بیرونی تجارت کی بنیاد رکھی۔ جہازی قطب نما، بارود اور چھاپا سب سے پہلے انھوں نے ہی ایجاد کیا ہے۔

ان میں کنفوشش نامی ایک پیغمبر چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک اعلا اور منظم زندگی کی تعلیم دی اور اعلا اور منظم زندگی کی

ضرورتوں اور انسانی تعلقات کی تفصیلات کو آخری حد تک منضبط کرنے کی تلقین کی۔ چینی کردار کے ارتقا میں اس تعلیم نے بہت زبردست حصّہ لیا ہے۔ ان بزرگ کے عرصۂ دراز بعد بُدھ مت چین میں پہنچا اور نہایت وسعت کے ساتھ پھیل گیا۔

چین کا مجرد پُرامن اور بیرونی حملوں سے محفوظ و مامون رہنا ہی اس کے جمود کا باعث ہوا۔ دوسرے ملکوں میں انسان مسلسل لڑائی جھگڑوں کے صدموں اور قومی دست دشمنوں سے کبھی نہ ختم ہونے والی کشاکش کی وجہ سے ترقی کرنے پر مجبور ہوا (بالکل اس طرح جیسے کہ زمانۂ ماقبل انسان میں خود ہماری نسل کی مختلف شکلوں کے ساتھ پیش آچکا ہے) مگر چین میں اس کی زرخیز زمین، اس کی مستحکم مرکزی حکومت، اس کے پہاڑ اور ریگستان، اور سمندر کے محافظ حصار، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو مشکل ہی سے انسان کو ترقی کرنے پر مائل کرسکتی ہیں۔ ابتدائی زمانے میں انسانی جبلتوں کو ایک بڑی جماعت کی خدمت کے لیے تیار کرنے کے مسئلے کو حل کرلیا گیا تھا، اس لیے ہم کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چین والے ہزاروں برس سے (بعض وقفوں کے ساتھ) ایک ایسی زندگی بسر کرتے آئے ہیں جو کئی اعتبار سے فی الحقیقت مہذب اور امن پسند ہے۔ لیکن چینیوں نے جس جماعت کی خدمت کی، اگرچہ وہ خود بہت وسیع، محترم اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن یہ خدمت پوری انسانیت کی خدمت کے مترادف نہیں ہوسکتی۔ رفتہ رفتہ یہ ترقی گوشہ نشینی اور قناعت پسندی میں گم ہوتی گئی۔ اہلِ چین کی نظر میں وہ لوگ جو ان کی "آسمانی بادشاہت" کے افراد نہیں تھے، بیرونی وحشی یا اجنبی شیطان بن گئے۔ اس اثنا میں ان کا تمدن فرسودہ اور بے کار ہوتا گیا اور ان کی عام زندگی فاسد ہوگئی۔ گزشتہ دو نسلوں کے دوران میں چین

کا دروازہ بڑی مشکلوں کے بعد دُنیا کے لیے کھُل سکا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ چینی تہذیب صرف ایک چوتھائی[1] بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے وقف رہتی، اس سے پوری انسانیت کی خدمت گزاری کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مطالبے نے فتنہ و فساد، انتشار، انقلاب اور رنج والم پیدا کیا، لیکن اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ چینی روح، جس کی پُرامن صنعت وحرفت اور جس کی شدید ضبطِ نفس نے ماضی میں اتنا کچھ حاصل کیا تھا، وہ ضرور اس قابل ہوگی کہ اپنے آپ کو ان نئے حالات کے لیے موزوں ثابت کرے اور اپنی وفادارانہ و صابر خدمت گزاری کے دامن کو پوری انسانیت کے لیے کُشادہ کردے۔

دُنیا کے لیے چین کی اہمیت

اہلِ چین بڑے صابر، جفاکش اور پُرامن ہیں۔ اتنی زبردست اور بڑی جماعت کے ساتھ وفادار رہنے کی صفت بھی بہ درجۂ اتم ان میں موجود ہے۔ یہ بڑی جماعت وہ ہے جس سے ان کی مملکت کی تشکیل ہوئی ہے۔ لیکن انسانیت کے لیے ان کی حقیقی اہمیت اس میں نہیں۔ ان کی حقیقی اہمیت ایسی مثال پیش کرنے میں ہے، کہ انسان اس پر عمل کرکے اپنی نسل کے مستقبل کے کام آ سکتا ہے۔

ہر چینی اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خُدا اور اس کے اسلاف (یہ اسلاف وہ ہیں جن کے وسیلے سے وہ خُدا کی عبادت کرتا ہے) کی طرف سے اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے بہ رضا و رغبت اور بے دردی کے ساتھ اپنے آپ کو قربان کردے۔ اس سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چینی صرف اپنے ہی خاندان کی خدمت کرتا ہے کیوں کہ کئی اعتبار سے وہ نمونے کا شہری اور محبِ وطن بھی ہوتا ہے۔ اپنے معاملوں میں وہ ایمان دار اور قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ وہ کسی

---

[1] چینی مملکت کی آبادی چالیس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ذات پات کی قیدوں کا پابند نہیں کہ اپنے ہم جنسوں سے الگ ہو جائے۔ وہ قانون کا پابند اور امن پسند ہوتا ہے۔ وہ اپنے عظیم الشان ملک کا احترام اور اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ اس کی آزادانہ اور رضامندانہ خدمت گزاری کی صلاحیت کا مظاہرہ سب سے زیادہ واضح طور پر مستقل یعنی اپنے ننھے ننھے بچوں اور آیندہ نسلوں کے ساتھ وابستگی کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ یہ اس کا فرض ہے کہ خاندان کی پرورش کے لیے وہ اپنے آپ پر فرصت اور آرام کو حرام کرلے۔ اس طرزِ عمل کا عکس اس محبت اور احترام میں نظر آتا ہے جس سے وہ اپنے والدین کے ساتھ پیش آتا ہے۔ والدین ہی نے اس کو زندگی بخشی اور زندگی کی نعمت سے متمتع ہونے کا موقع عطا کیا ہے۔ چینی مذہب اور خاص طور پر بزرگ فیلسوف کنفوشش کی تعلیمات نے اس قومی خاندانی احساس کو اتنا پاک اور مجلا کر دیا ہے کہ وہ دُنیا کے متعلق چینی طرزِ عمل کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ چین انسانی زندگی کے ساتھ بارآور ہوتا ہے۔ بچے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ آبادی اتنی زیادہ ہے کہ زمین کی زرخیزی، قوم کی انتہائی محنت اور جفاکشی کے باوجود شدید افلاس اسے پیسے ڈالتا ہے۔ لوگوں کی کثیر تعداد ایسی ہے جو ہمیشہ نیم فاقہ کشی میں مبتلا رہتی ہے۔ ذرائع زندگی پر آبادی کا ہجوم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض وقت بارش کی قلت لاکھوں کو نذرِ اجل کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چینی قیدخانوں کو خوف ناک حالت میں رکھنا پڑتا ہے۔ اور سزائیں وحشیانہ دینی پڑتی ہیں کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو غریب لوگ جرم کا ارتکاب محض اس لیے کرنے لگیں گے کہ قید کر دیے جانے پر وہ قیدخانے کے روز پینے سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ موت کی سزا کا

ملزم ایک ایسا بدل پیدا کر سکتا ہو جو اس خیال سے ملزم کی جگہ خوشی سے پھانسی پانے کے لیے تیار ہوجاتا ہو کہ اس کا معاوضہ رقمی صورت میں اس کے خاندان کو ادا کر دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ عجیب کوئی قوم نہیں ہو سکتی جس کا فرد اپنے وارثوں کے لیے ذرائعِ معیشت مہیا کرنے کے لیے بخوشی مرنے پر آمادہ ہو جائے۔

ایک مثال چینیوں کے تجارتی انتظامات اس طریقۂ کار کی ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں جس میں لوگوں کے اغراض و مقاصد اور جبلتوں کو آنے والی نسل کی ضرورتوں کے لیے مطیع کیا گیا ہو۔

"وسیع چینی صنعتی انتظامات گو تمام تر نہیں، بیش تر غیر ماہر مزدوروں پر مشتمل ہیں اور یہ مزدور کوئی ایک تجارت کرنے والے افراد تک محدود نہیں ہیں۔ صنعتی ادارے اور مزدور میں معاملات طے پاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہو کہ کسی دور دراز گانو کا ایک نوجوان صنعتی ادارے سے معاملہ کرے کہ وہ چند مقررہ سالوں (عموماً چھے سال) تک کے لیے اس کی مزدوری کا انتظام کرے۔ صنعتی ادارہ اسے جہاں بھیجنا چاہتا ہو وہ چلا جاتا ہو اور جو کام جس وقت کرنا پڑے، اسے انجام دیتا ہو۔ ادارہ اس کے کھانے، کپڑے اور رہنے کا انتظام کرتا ہو۔ اگر بیمار ہو جائے تو بیماری کے زمانے میں یا اس چھے سال کے دوران میں وہ بے کار رہے تو اس کی گزر بسر کا انتظام بھی ادارے ہی کے ذمے ہوتا ہو۔ اس پوری مدت میں وہ کوئی اُجرت یا انعام نہیں پاتا، مگر چھے سال کے اختتام پر ادارہ اسے اس کے گانو کو بھیج دینے کا ذمے دار ہوتا ہو۔ اقرار کے مطابق رقم اسے یک مشت ادا کر دی جاتی ہو۔ ادارے کے مصارف بھی نمایاں طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ ادھر یہ بھی واضح ہو کہ ایک ایسا شخص جو گھر بار سے دور ہو اور جس کا سارا دار و مدار ادارے پر ہی ہوتا ہو، سستی، کاہلی یا نااہلیت کا شبہ پیدا کرنے کے خطرے میں مبتلا ہونا گوارا نہیں کر سکتا، کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو ادارے کو اس کے معاملے کے کسی جز کو حذف کر دینے کا موقع مل جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ مزدور بڑی

بے جگری اور بے رحمی کے ساتھ اپنے آپ کو کام پر لگاتا ہے۔ عموماً چھ سال کے اختتام تک اس کی طاقت اور صحت دونوں جواب دے چکتے ہیں اس لیے ادارے کو کسی مزید میعاد کے لیے اس کی خدمات قبول کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا لیکن جب ایک بار وہ گھر پہنچ جاتا ہے اور اپنی مختصر سی پونجی حاصل کر لیتا ہے تو پھر منظر ہی بدل جاتا ہے .... وہ اپنی بیوی خرید کرتا ہے اور ایک خاندان کا باپ بن جاتا ہے۔"[1]

ہو سکتا ہے کہ یہ غلامی کی ایک بھیانک تصویر معلوم ہو لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ چینی مزدور اپنی رضامندی سے اس لیے غلام بنتا ہے کہ اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے ذرائع معیشت بہم پہنچائے۔ یہ تمام محنت و مشقت اور معاشی حالات کا یہ سارا درد انگیز دباؤ جو ایسی محنت و مشقت کو ضروری بنا دیتا ہے، صرف اس لیے بہ خوشی برداشت کر لیا جاتا ہے کہ مستقبل کو بقا اور نسل کو استحکام نصیب ہوگا۔

تیسرا باب

عیسائیت اور اسلام

یہودی مذہب اس سے پہلے ہم چھوٹی سی یہودی قوم کے فلسطین میں قیام اور اس کے عروج کا مختصراً جائزہ لے چکے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وہ مسلسل حملوں کے صدمے سہتی رہی اور مختلف وقتوں میں جلاوطن ہوتی رہی۔ ان مصیبتوں کے دوران میں دو اہم ترقیاں عمل میں آئیں۔ ایک تو یہ کہ یہودیوں میں پیغمبرانِ عظام کا سلسلہ بعثت شروع ہوا جنھوں نے ایک

---

[1] ہنتیار ڈکی کتاب "مملکتوں کی قسمت" صفحہ ۱۵۸۔

ہمہ گیر خدا کی عظمت و قدوسیت کا اعلان کیا۔ دوسرے یہ کہ فلسطین میں ایک نئی انسانی جماعت یعنی قوم کی صورت نے نشوو ارتقا پایا۔

یہودی جس خدا کی عبادت کرتے تھے وہ ابتداً ان خانہ بدوش لوگوں کا قبائلی معبود تھا لیکن مصر کی طویل جلا وطنی اور حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کی تعلیم نے ان میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ان کی نسل کا یہ خدا ان سے بہ طور اپنے بندگانِ خاص کے تقوے کا طالب ہے۔ تقوے سے مراد ایک سلسلۂ قوانین کی پابندی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ قدیم جبلّتوں کا انضباط صرف شخصی جماعتی اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے ہی نہ کیا جائے بلکہ اس لیے بھی کیا جائے کہ خود خدا بندوں سے طہارت، دیانت، محبت اور دوسرے صفاتِ حسنہ کا طالب ہے۔ چناں چہ جیسا کہ شریعتِ موسوی میں ظاہر کیا گیا ہے، تقوے سے یہودیوں کے دل میں ایک شخصی خدا کی اطاعت کا احساس پیدا کرنا تھا۔ بہر حال ایسے تقوے پر ایمان لانے کے لیے ان کو مناسب طریقوں سے قابل اور مہذب بنایا گیا جس کی ان کو ضرورت تھی کیوں کہ یہ اپنی خانہ بدوشانہ زندگی کے بعد بمشکل ابھی قیام پزیر ہوئے تھے۔

کئی صدیوں تک یہودی اس بات پر ایمان رکھتے رہے کہ اس تقوے کا خدا صرف ان ہی کا خدا ہے اور اطراف و جوانب کے باشندوں اور سلطنتوں سے ان کی لڑائیوں میں وہ اپنے بندگانِ خاص کی مدد کرتا ہے۔ ان جنگوں میں ان کی مسلسل شکستیں اور بربادیاں ان کے خدا کی ایسی ناراضگی پر محمول کی گئیں جو اس کو بھلا دینے اور اس کے احکام کی نافرمانی کا نتیجہ تھیں۔ اس طرح ان کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ گناہ خدا کی مرضی کی خلاف ورزی کا نام ہے اور یہ خلاف ورزی لازمی طور پر مبتلائے آلام کرتی ہے۔

اس کے بعد متعدد پیغمبر یکے بعد دیگرے مبعوث ہوتے گئے۔ ان پیغمبروں

میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت حضرت عیسیٰؑ تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس خدائے خیر کی نسبت قومی تنگ خیالی کو دُور کر کے عالم گیر خدائے خیر کے وسیع و عظیم تصور کی تبلیغ کی کہ وہ ایک ایسا خدا ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کی خبر گیری اور اس سے محبت کرتا ہے اور اپنے قانون کی پابندی سے خوش ہوتا ہے۔ تنہا اس کی مرضی اور خوشی سے ساری دُنیا امن و آشتی اور خیر و برکت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن یہودی آبادی کے بیش تر حصّے نے اس تصوّر کا ذرا بھی خیر مقدم نہیں کیا اور نہ کبھی اس کو قبول کیا کہ ان کا قومی خدا دوسرے تمام بندوں کا بھی خدا ہے۔ لیکن یہ تصور صرف پیغمبروں کی ذات ہی تک محدود رہا بلکہ خود ان میں سے بڑی سے بڑی ہستی میں کچھ نہ کچھ یہ تنگی خیال باقی رہی اور وہ اس خیال کو دور نہ کر سکے کہ خدا کے پاس یہودی ایک مرتبۂ خاص پر فائز ہیں۔ اگرچہ وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ مرتبہ ان پر دوسرے بندگانِ خدا کی خدمتِ خاص کا فریضہ بھی عائد کرتا ہے۔

یہودی قومیت

جس غیر یقینی آزادی سے یہودی محظوظ ہو رہے تھے اس کو پہلے تو آشوریوں نے (۷۲۱ ق۔م میں) پھر کلدانیوں نے (۵۸۶ ق۔م میں) یونانیوں نے سکندر جیسے فاتح عالم کی قیادت میں ایرانی مملکت (اور اس کے ساتھ فلسطین بھی) فتح کر لیا۔ سکندر کے جانشین فلسطین پر ڈھائی سو سال تک قابض رہے اور بسا اوقات ان کی حکومت بدترین اور ظالمانہ رہی۔

یہودیوں میں اس عہد سے پہلے اور اس عہد کے دوران میں ایک ایسی چیز نشو و نما پانے لگی جو دنیا کے لیے نئی تھی۔ یہ نئی چیز قومیت کی روح کا شعور تھا۔ فلسطین میں ایک قوم یعنی انسانوں کی ایک جماعت نمودار ہوئی۔ یہ بہ اعتبار نسل و توارث خود کو باہم منسلک سمجھتی تھی۔ نیز اس اپنی زبان بولتی تھی اور اپنے

ہی خاص خطِ آراضی میں بستی تھی۔ تاریخ، حبِ وطن کے جذبے اور روایات نے اس کو یہ تصور سکھایا کہ وہ اپنی خاص تمدن کی آپ ہی مالک ہو اور تمام دوسری جماعتوں سے یہ علیحدہ جماعت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہو۔ قومیت ایک ایسی چیز ہو جو زیادہ تر جذبات اور احساسات پر مبنی ہوا کرتی ہو اس لیے یہ اس کی تعریف کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ قومیت کی جو تعریف اوُپر کی گئی ہو اس کا ہر فقرہ ایک یا ایک سے زیادہ ایسی قوموں کے لیے غیر صحیح ثابت کیا جا سکتا ہو جنھوں نے امتیازی قومیت کو حاصل کر کے اسے برقرار رکھا ہو۔ لیکن آج کل قومیت کی اصلیت انسانی تعلقات کے دائرے کے اندر جملہ اہم ترین حقائق میں پوشیدہ ہو۔

قوم، توطن اور تمدّن کے لحاظ سے قبیلے سے مختلف ہوتی ہو۔ ایک خاص خطے کے توطن کے اعتبار سے وہ ذات یا جماعت سے حریف ہوتی ہو حالاں کہ ایک ہی مُلک میں بہت سی ذاتیں اور جماعتیں مل جُل کر رہ سکتی ہیں۔ اکثر صورتوں میں قوم ایک ایسی مملکت سے مختلف ہوتی ہو جو کئی قوموں پر مشتمل ہونے کے باوجود بلا تخصیص ایک ہی زبان بولنے پر مجبور ہوتی ہیں اور نسل پیدائش کی رؤسے اپنے شہریوں کو علیحدہ سمجھتی ہو۔ قوم افراد کا ایک گروہ ہو جسے اپنی جُداگانہ حیات و بقا کے لیے کافی وسیع ہونا چاہیے۔ قوم کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ ہم نے جن امور پر ابھی غور کیا ہو، ان کی وہ پابند رہ سکے۔

تاریخ نے اس نئی چیز یعنی قومیت کی بے پناہ قوت کو ثابت کر دکھایا ہو۔ یہ قومیت وہ ہو جس کی پہلی مثال یہودیوں نے پیش کی تھی۔ تاریخ نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ قومی احساس سے مُراد وفاداری کی تحدید ہو جس کا دامن اتنا کشادہ ہونا چاہیے کہ وہ تمام دُنیا سے بغل گیر ہونے کے لیے آمادہ ہو سکے جیسا کہ ہم آگے

چل کر دیکھیں گے۔ اس طرح قومیت انسانیت کے لیے مہلک ترین خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہودیوں کی قومی علیحدگی

جب ہم یہودیوں کی رفتارِ ترقی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس قبائلی حالت سے قومیت میں تبدیل ہو گئے، اس کے صرف دو سبب ہیں۔ پہلا سبب مضبوط مذہبی بندش تھی جس میں وہ متحد ہو گئے۔ اور دوسرا سبب تباہیاں تھیں جو ان پر آپڑیں۔ ان تباہیوں نے جوشِ اتحاد کو کم زور کرنے کی بجائے اسے اور مستحکم کر دیا۔ کیوں کہ اپنے "خاص بندوں" پر خدا کی ناراضگی کی علامت کے ظہور نے ان کی اعلا قوتوں کے ابھارنے کا کام دیا۔ یہی اعلا قوتیں یہودیوں کی قومی زندگی کو از سرِ نو بحال کرنے کا باعث ہوئیں۔ اپنے وقت کے پیغمبر صرف مذہبی معلّم ہی نہیں تھے بلکہ اس سے زیادہ بہت کچھ تھے۔ ان میں سے بہت سیاسی قائد بھی تھے۔ عموماً ان کا پیغام خدا کی بندگی ہوتا تھا۔ اس میں اکثر غیر مذہب والوں اور غیر ملکیوں سے شدید ناروا داری بھی شامل ہوتی تھی۔ غیر ملکیوں نے یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے ان سے یہ ناروا داری اور بھی زیادہ زہر آلود ہو گئی۔ اس طرح ان میں نہ صرف جداگانہ قومیت کا قوی اور نمایاں احساس پیدا ہو چلا بلکہ انھیں دوسری قوموں سے نفرت بھی پیدا ہو گئی۔ جس کی بنیاد اس تعین پر تھی کہ یہودیوں کے مذہبی اور سماجی ادارے دوسری تمام قوموں کے مذہبی اور سماجی اداروں پر قطعی برتری اور تفوق رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ جیسے زبردست پیغمبر نے اس متعصبانہ قومی تفاخر کے خلاف بے سود احتجاج کیا۔ انجیل کی کتاب یوحنا میں غیر قوموں کے ساتھ یہودیوں کی اس مخصوص روش کے متعلق بہت بری طرح تحقیر کا اظہار کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم دی تھی کہ یہودیوں کو دوسری قوموں پر اپنے تفوق کی وجہ سے نازاں نہ

ہونا چاہیے بلکہ انھیں اس بات پر نازاں ہونا چاہیے کہ خدا نے خاص طور پر انھیں غیر قوموں کی ادنا خدمت اور ان کے لیے ایثارِ نفس کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ مگر عام طور پر اس تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی، اور حضرت عیسیٰ کے زمانے میں یہودیوں کو رومی نسلِ انسانی کے دشمن تصور کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہودیوں کی تاریخ ایک پُر نخوت اور علیحدگی پسند قومیت کے خطرات اور اس کے آخری انجام سے متعلق ایک خوف ناک تنبیہ ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح کے دوران میں یہودی قوم اگرچہ ایک چھوٹی اور کم زور قوم تھی مگر یہ یونانی ظالموں کے خلاف سخت بغاوت کر کے کچھ عرصے کے لیے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے میں کام یاب ہو گئی۔ آخرکار رومیوں کی بڑھتی ہوئی منظم اور طاقت ور مملکت نے ان کو کچل کر تباہ کر دیا۔ ۷۰ء میں اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو پھر حاصل کرنے کے لیے یہودیوں کی شدت پسند سرشت نے ان کو ایک جان توڑ کوشش پر آمادہ کر دیا۔ مگر یہ بغاوت نہایت تیزی اور شدید بے رحمی کے ساتھ دبا دی گئی اور بیت المقدس برباد کر دیا گیا۔ اس وقت سے یہودی اپنے وطن سے نکال دیے گئے اور روز بروز منتشر ہوتے ہوئے مظلوم تاجروں کی جماعت بن کر رہ گئے۔ تاہم دو ہزار سال سے بغیر کسی ملک کے ایک قوم رہنے کے باوجود یہودی اپنے قومی جذبے کو برقرار رکھنے میں کام یاب رہے۔ ایسی شدید مصیبتوں میں جن کی مثال کہیں نہیں ملتی، اس یہودی قومیت کے تحفظ میں سب سے اہم عامل یہودی مذہب رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں اس بات کا امکان پیدا ہو چلا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قومی وطن بن جائے۔

عیسائیت

قدیم یہودی مذہب سے عیسائیت وجود میں آئی۔ ہندستان میں گوتم بدھ فاتح آریاؤں کی نسل سے تھے۔ فلسطین میں حضرت

عیسیٰؑ اس نسل کے ایک فرد تھے جو صدیوں سے آریا فاتحوں (ایرانی، یونانی اور رومی) کے زیرنگیں رہ چکی تھی لیکن حضرت عیسیٰؑ جس نسل سے تعلق رکھتے تھے، اس نے انھی فاتحوں کے تحت احساسِ قومیت کو خوب ترقی دی۔ یہ احساسِ قومیت اپنی گزشتہ تاریخ، اپنے مذہبی اور سماجی اداروں پر نازاں ہونے اور دوسری تمام غیر قوموں سے متعصبانہ علیحدگی کا جذبہ تھا۔ ایسے حالات میں توقع کی جا سکتی تھی کہ معلمِ اعظم ان کا قومی رہنما ہوگا۔ ایک ہر دل عزیز ہیرو ہوگا جو اپنے ہم وطنوں کو ان کے فاتحوں کے تسلط سے نجات دلائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک ایسی توقع تھی جس کے خود بہت سے یہودی متوقع تھے۔ متعدد موقعوں پر حضرت عیسیٰؑ کو روما کے خلاف بغاوت کرنے کا مشورہ اور موقع دیا گیا۔ مگر انھوں نے نہایت استقلال کے ساتھ ان خواہشاتِ عامّہ کی تکمیل سے انکار کر دیا۔ اس باب میں ان کی ناکامی ان کے ہم وطنوں کے لیے ایک حد تک ان سے بیزاری کا باعث ہوئی۔ اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں نے غدّاری سے انھیں رومیوں کے حوالے کر دیا اور رومیوں کے ہاتھوں پھانسی کے وحشیانہ فعل سے ان کی موت واقع ہوئی۔

خدائی بادشاہت

حضرت عیسیٰؑ نے ایک قومی نجات دہندہ بننے کی بجائے اس عقیدے کی تبلیغ کی جسے انھوں نے "خدائی بادشاہت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کی قوم کے بڑے بڑے پیغمبروں نے خدا کے اس تصور کی تبلیغ کی کہ وہ تمام بنی نوعِ انسان کا حاکم ہے اور اپنی تمام مخلوق سے اعمالِ صالح اور اپنی مشیت کی تعلیم کا خواہاں ہے۔ اس زبردست تصور پر حضرت عیسیٰؑ نے اپنی تعلیم میں اس قدر اور اضافہ فرمایا کہ خدا اپنے بندوں سے مساوی طور پر محبت کرتا ہے، خواہ اس کے بندوں کی

نسل یا ذات کچھ ہی ہو، چاہے ان کی حالت کتنی ہی فلاکت زدہ ہو، خواہ ان کے اخلاق کتنے ہی ذلیل اور مذموم ہوں۔ خود حضرت عیسیٰؑ نے اپنی زندگی فلاکت اور مصیبت میں بسر کی اور ایسے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنے کی عادت ڈالی جنھیں ان کے ہم وطنوں نے یا تو اپنے ملک کے غدار سمجھ کر نکال دیا تھا، یا بے دین، بدنام اور بے مایہ سمجھ کر ان سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایسے ہی ساتھیوں کا انتخاب فرمایا اور مذہبی و معزز طبقے سے گریز کرنے لگے، کیوں کہ جیساکہ خود انھوں نے فرمایا "طبیب کی ضرورت ایسے لوگوں کو نہیں جو تن درست ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو ہے جو بیمار ہیں"۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے ستروشدہ اور مردود لوگ ہی ان کی مدد کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے تعلیم دی تھی کہ بنی نوعِ انسان کے تمام تعلقات اس حقیقتِ عظمیٰ کے مطابق استوار کیے جائیں کہ خدا سب کو چاہتا ہے اور سب سے یکساں محبت کرتا ہے۔ چناں چہ انسانی جمعیت کے اس نئے قانون کی تشریح وہ عام طور پر واضح قصوں سے فرمایا کرتے تھے۔ اپنے نئے قانون کو وہ "خدائی بادشاہت" کہا کرتے تھے۔ خدائی بادشاہت میں تمام بنی نوعِ انسان کو اپنے آسمانی باپ کی مرضی کے مطابق مِل جُل کر رہنا چاہیے یعنی محبت، آزادی اور ایک دوسرے کی ہر طرح خدمت کرنا اور اپنی ذاتی خواہشوں اور مفادوں کو کل کی بہتری کے لیے کم سے کم کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں حضرت عیسیٰؑ نے وہی فرمایا جو ہم نے حقیقی تہذیب کی احساس کی تعریف میں کہا ہے۔ اس تصور کے تحت انھوں نے اپنی زندگی غریبوں اور بیماروں کی اَن تھک خدمت گزاری میں بسر کی، اور اسی تصور کے حصول میں انھوں نے اپنی جان دی۔ اس طرح انھوں نے اپنے قول و فعل سے جمہوریت آزادی اور تہذیب کی روحانی بنیادیں رکھیں جیساکہ

ہمیشہ اس بات پر ایمان رکھتے آئے ہیں کہ خود خدا نے یسوع مسیح کی ذات میں جنم لیا تھا اور یہ کہ مرنے کے بعد مسیح پھر زندہ ہوئے اور دنیا کو مصیبت سے نجات دلانے کے لیے بیت المقدس میں مصلوب ہوئے۔ دنیا کو مصیبت سے نجات دلانے سے مراد ایسے نفس کے ظلم سے بچانا ہے جو بے لگام جبلت سے پیدا ہوتا ہے اور جو خدمت خلق کے کام نہیں آتا۔

عیسائیت جہاں تک اپنے بانی کے خیالات کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے، وہ آزادانہ اور رضامندانہ ایثار پسند خدمت گزاری کے اصول کی زیادہ سے زیادہ وسعت پر مبنی ہے۔ عیسائیوں نے ایثار نفس پہلے تو اس لیے اختیار کیا کہ خود خدا نے گزشتہ زمانے میں مسیح کے قالب میں انسانیت کے لیے مصیبتیں برداشت کیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰؑ ابھی زندہ ہیں اور انسانیت کی ترقی میں اپنے خادموں کی صورت میں حصہ لے رہے ہیں۔

عیسائیت کی تاریخ

ایک نقطہ نظر سے عیسائیت کی تاریخ ناکامی کی ایک طویل یادداشت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شروع میں عیسائی بری طرح ستائے گئے لیکن حضرت عیسیٰؑ کے بعد تین ہی صدیوں میں یہ عظیم الشان رومی سلطنت کا سرکاری مذہب بن گئی۔ کچھ دنوں کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس وقت عیسائی کلیسا میں جو خرابیاں موجود تھیں ان کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کا نصب العین خدائی سلطنت میں عالم گیر برادری کا حصول شاید حقیقت سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اس وقت آریا اور منگولی حملہ آوروں کا ایک تازہ سیلاب آیا اور دنیا پھر ایک بار بربریت اور وحشت کی دلدل میں پھنس گئی۔ ایک ہزار

سال سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد جب یورپ نے تہذیب کے اس اعلا معیار کو حاصل کرنے کی پھر کوشش کی جو اس نے کبھی رومیوں کی حکومت میں حاصل کیا تھا تو وہ مہلک طور پر معاندانہ قومیتوں میں بٹ گیا۔ یہ اختلافات آج بھی ہمارے زمانے تک قائم اور برقرار ہیں بلکہ مسلسل خوں ریز جنگوں کی وجہ سے یہ خلیج اور زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ عیسائیت ان جنگوں کو روکنے یا متحارب قوموں کو متحد کرنے میں بے بس نظر آتی ہے۔ بربریت کے ہزار سالہ اختلال کے دوران میں مستحکم و منظم رومی کلیسا نے اُن روایاتِ اتحاد کی بنا پر جو اس نے فنا شدہ رومی سلطنت سے ورثے میں پائی تھیں، اور اپنے فاضل راہبوں کی موجودگی سے یہ بیش بہا خدمت انجام دی کہ علم اور تمدن کے بعض آثار کو تباہی سے بچا لیا اور رفتہ رفتہ وحشیوں کو تعلیم و تربیت سے مانوس کیا اور کم از کم سطحی طور پر ایک اعلا اخلاقی اور مذہبی اقتدار کی اطاعت پر آمادہ کیا۔ نیز عالم گیر بدنظمی اور خوں ریزی کے طوفان میں ایسے لوگوں کے لیے جائے پناہ مہیا کی جو بہتر مستقبل کے لیے خاموشی سے کام کرتے رہیں لیکن گزشتہ پانچ سو سال کی عیسائیت کی تاریخ ایک یاس انگیز داستان ہے جس میں وہ نہ صرف کشمکشِ اقوام کو روکنے میں ناکام رہی بلکہ خود عیسائی کلیسا کے اندر اختلافات کو نہ روک سکی اور اس دور کے ابتدائی ایام میں مذہبی خانہ جنگی اور بے رحمانہ مظالم کا بھی تدارک نہ کر سکی۔ انفرادی طور پر ایسے بہت سے وسیع النظر اور پُر جوش عیسائی بھی گزرے ہیں جو ان قومی، نسلی اور جماعتی حدوں کو توڑ کر آگے بڑھ گئے۔ مگر ایک منظم ادارے کی حیثیت سے کلیسا کا نظام پارہ پارہ ہو چکا تھا اور اس میں سینکڑوں قومی اور فرقی جماعتیں بن گئی تھیں۔ بین الاقوامی ناانصافی رقابت اور باہمی جھگڑوں کے روکنے میں اس کی عدم صلاحیت سے ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ اپنے بانی کی بتائی ہوئی آزادی اور محبت کی عالم گیر "خدائی بادشاہت" کے نصب العین کو حاصل کرنے میں کس بری طرح ناکام رہے تھے۔

تاہم آج بھی تصور، شاید ہمیشہ سے زیادہ انسانوں میں زندہ اور کارفرما ہے۔ کم زور اور تنزل یافتہ انسانوں کو ابھارتے ہیں، بیماروں کی خبرگیری اور علاج میں، علم، مساوات اور آزادی کے خیالات پھیلاتے ہیں، غلامی کے انسداد اور ادنا انسانی طبقوں کا معیار بلند کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر تعیش و غلط کاری کو دعوت مقابلہ دیتے ہیں جسے "رائے عامہ" کہا جاتا ہے۔ یہ خدائی بادشاہت جس کے لیے حضرت عیسیٰ ؑ نے اپنی جان دی، متعدد مختلف سمتوں میں ترقی کر رہی ہے اور انسانوں میں، انسانیت کی بے غرض خدمت اور ایثار نفس کے تصورات پیدا کرنے میں سرگرم عمل ہے۔

اس کے علاوہ، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے موجودہ زمانے میں گزشتہ کئی صدیوں کی بہ نسبت اس کی زیادہ توقع ہے کہ خدائی بادشاہت کے تصورات متحارب نسلوں اور قوموں پر بھی موثر عمل کریں گے۔

عرب یہودی سامی[1] نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو جنوبی تفقازی نسل کی ایک خاص شاخ ہے۔ یہ دراصل قدیم آشوریوں اور فنیقیوں کی طرح عرب میں خانہ بدوش تھے۔ ایران، یونان، اور روم میں آریا سلطنتیں جن شمالی حملوں کے بعد قائم ہوگئیں، ان سے سینکڑوں سال بعد اور قدیم تمدنوں کو غارت کر دینے والے آریا اور منگولی حملے کے ابتدائی سیلاب سے بہت پہلے

---

[1] "سامی" کی اصطلاح "آریا" کی اصطلاح ایک نسل یا ئی نسلوں کے مجموعے کو ظاہر کرنے کے بارے میں بالکل صحیح نہیں کیوں کہ حقیقتاً اس کا تعلق زبان سے ہے۔

عرب سے سامی خانہ بدوشوں کا ایک دوسرا زبردست طوفان اٹھا۔

ساتویں صدی عیسوی کے یہ عرب حملہ آور نہ صرف مضبوط اور پرجوش قبائلی وفاداری کے حامل تھے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ وفاداری کے ساتھ ایک نئے مذہب سے وابستہ تھے۔ یہ نیا مذہب اسلام تھا۔ اس صدی کی ابتدا میں عرب میں اسلام کا ظہور ہو چکا تھا جو نتیجہ تھا پیغمبر اعظم حضرت محمدؐ کی تعلیم اور عملی زندگی کا۔ اتحاد اور جوش و خروش کی جو روح اس دین نے عرب فاتحوں میں پھونک دی اس کے اثر سے وہ سو سال کے اندر اندر مشرق میں ہندستان اور مغرب میں اسپین تک پھیل گئے۔ تاریخ میں یہ لوگ ریگستان اور میدانوں میں بسنے والے وحشیوں کی طاقت کا نہایت ہی غیر معمولی حیرت انگیز نمونہ پیش کرتے ہیں۔ انھی لوگوں نے ثابت کر دکھایا کہ جب کبھی کسی زبردست مقصد سے متاثر ہو کر اٹھتے ہیں تو کوئی سلطنت یا کوئی ادارہ چاہے وہ کتنا ہی قدیم اور کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو ان کی راہ میں حائل ہو کر سرنگوں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت محمدؐ

حضرت محمد صلعم (۵۷۰ء، ۶۳۲ء) کا نہایت ہی پختہ عقیدہ تھا کہ ایک اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ موجود اور نگاہوں سے مستور ہے، جو تمام کائنات کا خالق اور تمام مخلوقات کا حاکم ہے۔ آپ نے بُت پرستی کو ایک نہایت ہی شرمناک اور نفرت انگیز فعل قرار دیا کہ بندوں میں خُدا کی روحانی عظمت کا جو اعلا تصور ہونا چاہیے بُت پرستی اس تصور کی توہین اور تذلیل ہے۔ ابتدائی مسلمانوں[1] کو ان کے ہادی کے اس واثق یقین نے جو انھیں خُدا کی قدرت اور عظمت پر تھا، ایسی عسکری رفاقت

[1] "مسلم" کی اصل "سلما" سے ہے جس کے معنی سرِ تسلیم خم کرنے کے ہیں۔ اس لیے مسلم وہ ہے جو اسلام لاتا ہے یعنی راضی بہ رضائے الٰہی ہوتا ہے۔

میں متحد کر دیا کہ یونان، ایران اور روما جیسے ملکوں کی تہذیب کی فرسودہ خراب باقیات ان کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہ گئیں۔ خدائے واحد کی اطاعت میں تمام مسلمان بالکل متحد اور بھائی بھائی تھے۔ حضرت محمد صلعم نے فرمایا "لوگو! میرا کہنا سنو، اور غور کرو۔ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے تم سب آپس میں برابر برابر ہو۔" یہ اصول آج بھی بڑی حد تک کارفرما ہے، اور اسلام اپنی بقا کے لیے اسی کا ممنون ہے۔

اسلام کا اثر

اس طرح حضرت محمد صلعم اور آپ کے مذہب نے جو ایقان پیدا کیا وہ ایک ٹھوس اور مساوات و اخوت کی عملی روح تھی۔ اسی نے ان تمام لوگوں کو جو ایک ان دیکھے خدائے قادر مطلق کو ماننے والے ہیں، باہم دگر مربوط و متحد کر رکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی اخوت نے بعض وقت دوسرے مذہبوں سے تعصب و تنگ دلی برتی، اور اپنے ہی مذہب کی اشاعت میں قوت سے کام لینے پر مائل رہی، لیکن مسلمانوں نے اسلام کے ماننے والوں کی صفوں کے اندر حقیقی اخوت و مساوات قائم کرنے میں عیسائیوں سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ چین سے لے کر مراکو تک، مسلمانوں کا برادرانہ احساس، خواہ ان کی نسل یا رنگ، زبان یا قومیت یا ذات یا پیشہ کچھ بھی ہو، انسانیت کے لیے ایک اعلا روحانی تصور یعنی عالم گیر برادری کے حصول کے لیے بہت ہی اعلا نمونہ ہے۔ اگر اسلام اخوت و مساوات کی راہ سے ایسی بہت سی رکاوٹوں کو دور کر دینے میں کامیاب ہو گا، جو دوسرے مذاہب میں بہت مہلک ثابت ہو چکی ہیں، تو ایک روز ضرور تمام بنی نوع انسان کو متحد کرنے والی وسیع برادری کا قیام ممکن ہو جائے گا۔

عربوں کی فتوحات

اسلام دنیا میں آگ کی طرح پھیلا۔ عام طور پر اس تحریک کی ابتدا ۲۸ جون ۶۲۲ء تسلیم کی گئی ہے۔ جب کہ حضرت محمد صلعم اور ان کے ایک وفادار رفیق حضرت ابوبکرؓ نے مکے سے ہجرت فرمائی۔ مکے میں آپ کے خلاف قتل کی سازش کی گئی تھی۔ جب مدینے پہنچے تو آپ کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ دشمنوں نے راستے میں آپ کا تعاقب کیا، اور قریب تھا کہ دونوں گرفتار ہو جاتے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے پکار کر کہا "ہمارے مقابل لڑنے والے بہت اور ہم صرف دو ہیں"۔ حضرت محمدؐ نے فرمایا "نہیں، ایسا نہیں ہے اگرچہ ہم دو ہی ہیں، لیکن ہمارے درمیان تیسرا اللہ بھی ہے"۔ مدینے میں اس تحریک نے بہت جلد فروغ پایا۔ خانہ بدوش عرب قبیلے ایک زبردست اور ناقابل شکست قوت میں حیرت انگیز طور پر متحد کر دیے گئے۔ اپنی وفات سے پہلے حضرت محمد صلعم ایک فتح مند سلطنت کے مالک ہو چکے تھے۔ اور آپ کی اس حیثیت کو پورے عرب نے تسلیم کر لیا تھا کہ آپ ایک ایسے مذہب کے پیشوا اور صاحب وحی ہیں جو سیدھا سادا، تقویٰ آموز اور رہبانیت سے آزاد ہے۔ ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک اسلام میں مذہب اور سیاسیات میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ دین کا پیشوا (خلیفہ یا جانشین رسول اللہ) اسلامی مملکت یا سب سے طاقت ور اسلامی مملکت کا فرماں روا بھی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید یعنی وہ متبرک کتاب جس کا ایک ایک حرف منزل من اللہ سمجھا جاتا ہے، اس کا مذہبی قانون اور اس کے ساتھ احادیث اور تفسیروں کا مجموعہ، صرف انفرادی اور جماعتی فرائض کا رہنما ہی نہیں بلکہ روزمرہ زندگی اور اسلامی ملکوں کا مجموعہ قوانین نظم و نسق بھی ہے۔ اس طرح اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں اسلامی اخوت نے ایک واحد مذہبی سیاسی اور عسکری اقتدار

اعلا کے تحت فتوحات وحکمرانی کا راستہ دکھایا۔ کوئی تعجب نہیں اگر ایک ایسی قوت جسے اس طرح متحد کیا گیا، اور جس کی ایک مرکزِ واحد سے اس طرح رہبری کی گئی۔ اکثر وبیشتر ناقابلِ مقاومت ثابت ہوئی ہو۔

حضرت محمد صلعم کی وفات کے دو سال بعد خلیفۂ اعظم حضرت عمرؓ کے عہد میں عربوں نے یرموک کے مقام پر یونانیوں کو شکست دی۔ تین سال بعد قادسیہ کی سہ روزہ معرکے میں انھوں نے سلطنتِ ایران کو زیر وزبر کردیا۔ ساتویں صدی کے وسط میں وہ مصر وشام، ارمینہ اور ایران کے مالک تھے۔ اس کے بعد پورا جنوبی افریقہ زیر کیا گیا۔ اندلس فتح ہوا، یہاں تک کہ فرانس پر بھی حملہ کیا گیا۔ قسطنطنیہ اس وقت دُنیا میں تہذیب کا سب سے بڑا مرکز اور مشرقی رومی سلطنت کا مرکز تھا، یہ بھی ساتویں صدی کے وسط میں تقریباً فتح ہوگیا تھا۔ اگر یہ پوری طرح فتح ہوجاتا تو تمام یورپ کا فتح ہوجانا نہایت قرینِ قیاس تھا۔ اسی دوران میں یہ فتح مندِ مذہب اور اقتدار مشرق اور شمال مشرق میں ہندستان اور وسطِ ایشیا کے راستے چین کی حدوں تک پھیل گیا۔ ۷۱۵ء میں خلیفہ ولید کی مملکت کی حدیں کوہ پیری دنیز سے لے کر چین تک وسیع ہوچکی تھیں، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد ساری دنیا دائرۂ اسلام میں داخل ہوجانے والی ہو۔

لیکن چند سال بعد قسطنطنیہ کے شہنشاہ نے اپنے دارالسلطنت کے قریب ایک بڑی جنگ میں مسلمانوں کو شکست دی۔ ۷۳۲ء میں چارلس مارٹل نے جو فرانکون کا سردار تھا (فرانک آریا حملہ آور تھے جنھوں نے فرانس میں آباد ہوکر عیسائیت قبول کرلی تھی) تورس کے مقام پر عربوں کو شکست دی، اور عیسائی جوابی پیش قدمی کا آغاز کیا۔

اس دوران میں اس وسیع اسلامی مملکت کے ٹکڑے ہونے شروع ہوے
رسل و رسائل کے بہترین ذرائع کے فقدان کا یہ قدرتی نتیجہ تھا۔ دور دست
علاقے کم و بیش خود مختار ہونے لگے۔ اگرچہ عباسی خلفا کے عہد میں بغداد میں
ایک درخشاں تمدن نے نشو و نما پایا تھا، لیکن انحطاط کے میلان کو تعیش اور
اخلاقی تنزل نے اور ترقی دی جو صدیوں تک مسلط رہا۔ آخر کار گیارھویں
صدی عیسوی میں عربی سلطنت وسط ایشیا اور اس سے آگے کے منگولی
خانہ بدوش سلجوقی ترکوں کے قبضے میں چلی گئی۔ ان کے بعد ان کے رشتے دار
ترکی عثمانی قبیلے نے ان کی جگہ لی۔ اس سے بہت پہلے ہی ترکوں نے اسلام
قبول کر لیا تھا، اور پہلی مرتبہ بغداد فتح کرنے کے بعد سے لے کر وہ حضرت محمد
صلعم کے دین کے سب سے زیادہ طاقت ور علم بردار بنے رہے۔

صلیبی محاربات

بیت المقدس کے عیسائی زائروں کے ساتھ عرب ہمیشہ
رواداری کا سلوک کیا کرتے تھے، اور انھوں نے یورپ
اور مشرق کے درمیان تجارتی تعلقات کو استوار کیا تھا۔ مگر تند خو سلجوقیوں نے
بیت المقدس کے زائروں کے ساتھ برا برتاؤ کیا، تاجروں کو لوٹ لیا، اور پھر
ایک مرتبہ قسطنطنیہ کی یونانی سلطنت کو فتح کر لینے کی دھمکی دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ یورپی عیسائی (جو بیش تر آریا تھے) منگولی اور سامی مسلمانوں کے خلاف متحد
ہو گئے۔ چناں چہ جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ جنگیں محاربات
صلیبی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ ان جنگوں کو یورپی تمدن کے ارتقا میں
بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شمال مغربی یورپ کے تند خو امیروں اور وحشی کسانوں
کو اپنے سے کہیں زیادہ مہذب جنوبی قوموں سے سابقہ پڑا۔ براعظم یورپ
وقتی طور پر ایک بڑے مقصد کے تحت متحد کر لیا گیا تھا کہ مسلمان فاتحوں کو

ہٹا کر انجیل کی ارضِ مقدس کو پھر ایک بار فتح کر لیا جائے۔ رومی کلیسا کی آواز پر صلیبی متحارب ہیں جمع ہوئے تھے، اس لیے رومی کلیسا کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

محاربات صلیبی وقفے وقفے سے تقریباً دو سو سال تک جاری رہے۔ کئی لحاظ سے یہ جنگیں قدیم خانہ بدوشوں کی ہجرت سے ملتی جلتی تھیں۔ بلاشبہ اس خانہ بدوشانہ جذبے کا تقدس اتنے وسیع طور پر تمام جماعتوں اور زمانوں میں پھیلتا گیا کہ "نوموں کی صلیبی جنگ" اور "بچوں کی صلیبی جنگ" تک کی نوبت آ گئی۔ اگرچہ ان دونوں کا خاتمہ ایک ہولناک المیہ پر ہوا۔ صلیبی محاربین اپنے اصلی مقصد میں خاص طور پر اس لیے ناکام رہے کہ مسلمانوں کے شہنشاہِ اعظم سلطان صلاح الدین نے تمام نسلوں کے مسلمانوں کو ان حملہ آوروں کے خلاف متحد کر کے عزمِ صمیم کے ساتھ ان کے حملوں کی مقاومت کی، اور ۱۱۸۷ء میں ان سے دوبارہ بیت المقدس فتح کر کے لے لیا۔

پندرھویں صدی عیسوی میں مغرب کی جانب مسلمانوں کی دوسری عظیم یورش شروع ہوئی۔ آخرکار ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہو گیا اور فاتح ترک تمام جنوب مشرقی یورپ میں پھیل گئے۔ سولھویں صدی کی ابتدا اور سترھویں صدی کے آخر میں ترک وائنا پر بھی حملہ آور ہوئے جو جرمنی کی جنوبی سرحدی چوکی تھا۔ یورپی قوموں میں نااتفاقی اور رقابت نے بظاہر اس کو ممکن کر دیا تھا کہ مسلمان سارے بر اعظم یورپ کو فتح کر لیں لیکن تعیش اور اخلاقی تنزل کے آغاز نے پھر ایک بار اس دباؤ کو ہلکا کر دیا، اور ترکی فتوحات کی موج پھر پیچھے کی طرف لوٹ گئی۔ یہاں تک کہ خود ہمارے زمانے میں ترکوں کے قبضے میں صرف قسطنطنیہ اور تھریس کا مشرقی حصہ رہ گیا ہے۔

عربی تہذیب

مختلف نسلوں کے مسلمان چھ صدیوں سے زیادہ عرصے تک ہندستان کی حکومت پر قابض رہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہاں منگولی مسلمانوں نے ایک نہایت عظیم الشان مغل سلطنت قائم کی تھی۔ انھوں نے دُنیا کے آگے ایک مکمل ترین طرزِ تعمیر پیش کیا۔ لیکن اسلامی تہذیب عربوں کے ابتدائی زمانے ہی میں اپنے انتہائے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ فلسفہ، تاریخ، علمِ ہندسہ، سائنس، شاعری اور سب سے بڑھ کر طب کے لیے دُنیا عربوں کے احسانِ عظیم سے گراں بار ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ یورپ اپنے پچھلے تہذیب و تمدّن کو بھلا کر وحشت و بربریت کی ظلمت میں پڑا ہوا تھا، عربوں کا اثر اور تعلیم ان کا بے تعصب حصولِ علم، یہ چیزیں وہ تھیں جو آخر کار یورپ کی علمی نشاۃِ ثانیہ کی ابتدا کرنے میں سب سے اہم عناصر ثابت ہوئیں۔ بصرہ، کوفہ، بغداد، قاہرہ اور قرطبۂ اندلس کی جامعہ میں شمالی یورپ سے عیسائی طالبِ علم آ آکر تعلیم پاتے اور استاد بن کر اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے۔

متعدد مشہور عرب عالموں اور حکیموں میں غالباً بخارا (ترکستان) کا ابنِ سینا (۹۸۰ء سے ۱۰۳۷ء) جس نے علمِ طب کو درجۂ کمال پر پہنچایا، اور قرطبہ کا ابنِ رشد (۱۱۲۶ء سے ۱۱۹۸ء) جو سب سے زیادہ قابل عرب فلسفی تھا، سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ ابنِ رشد ہی وہ شخص ہے جس نے یورپ کو صحیح تفکر کے تصور سے روشناس کرنے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ اس تصور کا اظہار سب سے پہلے یونان نے کیا تھا۔

عرب عالموں نے متعدد علمی جواہر پاروں کو یورپ منتقل کیا ہے۔ یہ جواہر پارے انھیں ہندستانی ذرائع سے حاصل ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم جبر و مقابلہ اور عرابی اعداد ہیں۔ آخر الذکر ایک بیش قیمت عطیہ ہے۔

کیوں کہ اس وقت تک کے بے تکے رومی اعداد کے استعمال سے ریاضی کی رفتارِ ترقی نہایت مایوس کن تھی۔ عربوں نے کاغذ سازی بھی کی، اور اس طرح آیندہ طباعت اور تعلیم کی اشاعت کے لیے راستہ تیار کر دیا۔

ہمارے زمانے میں اسلام بڑی تیزی سے افریقہ میں پھیل رہا ہے۔ اسلام جہاں کہیں جاتا ہے اپنے ساتھ تمام مسلمانوں کی عالم گیر برادری کا عقیدہ لے کر جاتا ہے۔ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ پر مضبوطی سے ایمان رکھتا ہے۔ وہ تمام ذاتوں، پیشوں، رنگ و نسل اور قومیت کی برباد کن بندشوں کے توڑنے میں نہایت مضبوط ہے اور ان ہی چیزوں نے دوسری قوموں اور مذہبوں میں مہلک افتراق ڈال رکھا ہے۔ دُنیا پر یہی اس کا سب سے بڑا احسان ہے۔

چوتھا باب

یونان

یونان کے آریا وحملہ آور

اب ہمیں بہت دور اُن تاریک دنوں کی طرف لوٹ جانا چاہیے جب کہ پہلے پہل آریا جنوب اور مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ غالباً حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش سے پندرہ سو سال پہلے یہ آریا شمالی یونان میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ یہ حملہ آور قبیلے اپنے آپ کو "ہلینی" کہتے تھے اور ان کی بولی ایک زبان کی مختلف شاخیں تھیں۔ یہ لوگ خوش رنگ تھے اور دوسرے آریاؤں کی طرح اپنے مردوں

کو جلایا کرتے تھے۔ چند صدیاں گزرنے کے بعد ان ہلینیوں نے کریٹ اور بحرا لے جین کی عظیم الشان منی آن سلطنت اور اس کے ساتھ وہاں کے اعلا ترقی یافتہ تمدن اور بحری قوت کو بھی تباہ کر دیا[1]۔ یہ خود بھی بہت تیزی کے ساتھ مشّاق ملاح بن گئے۔ سمندر پار نوآبادیاں قائم کرنے کے جذبۂ شوق نے ان میں بڑی ترقی کی۔ انھوں نے بحیرۂ ایجین کے تمام جزیروں اور اس کے اطراف کے ساحلوں پر اپنی نوآبادیاں قائم کرنی شروع کر دیں۔ اس کے بعد وہ شمال مشرق میں بحرِ اسود تک، مغرب میں اطالیہ، سسلی تک، اور شمال مغرب میں فرانس مارسیلز تک آگے بڑھ آئے۔ بحیرۂ اسود میں انھوں نے کریمیا تک اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ اس طرح بحرِ روم کے ساحلوں پر ہلینی یعنی یونانی نوآبادیاں پھیل گئیں۔ ہلینیوں کی فتوحات کی پہلی موج کے بعد مقدونیوں اور فریجنوں کی ایک دوسری موج آئی۔ اوّل الذکر تو یونان کے شمالی اضلاع میں آباد ہو گئے اور آخر الذکر ایشیائے کوچک میں پھیل گئے۔

عہدِ ہومر کا یونان

ہمیں آریاؤں کی ابتدائی زندگی کی ایک روشن تصویر الیڈ نامی زبردست نظم میں ملتی ہے۔ اس نظم کو ہومر نامی ایک اندھے شاعر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ نظم ایسے وقت لکھی گئی ہے جب کہ ہلینی فاتحوں نے ابھی ابھی یونان میں آباد ہو کر سمندر پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ان قبیلوں کی باہمی جنگ کا حال بیان کرتی ہے جو پہلی حملہ آور فوج اور دوسری فوج کے فریجنوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ان میں بعض قبیلوں نے تجارت یا رہزنی یا دونوں اغراض کے لیے اس مقام پر جہاں مشرق سے مغرب کا بڑی راستہ ایشیا سے یورپ میں گزرتے ہوئے بحیرۂ روم اور بحرِ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ

اسود کے درمیانی بحری راستے کو قطع کرتا ہو، وہاں ٹرائے نامی ایک مستحکم شہر آباد کر لیا تھا۔ الیڈ کے ساتھ کی نظم اوڈیسی ہیں غالباً اس وقت کی کہانیاں ہمارے ہاتھ لگتی ہیں جب کہ بحر اسود کی دریافت اور کھوج میں یونانی اپنے ابتدائی بحری سفر کر رہے تھے۔

ان عظیم الشان رزمیہ نظموں میں ہم ابتدائی آریائی معاشرت کا حال دیکھتے ہیں۔ ان میں تین طبقے ہوتے تھے، یعنی امرا، عوام اور غلام۔ ہندستان کے برہمنوں کی طرح ان میں حقیقی مذہبی پیشواؤں کا کوئی طبقہ نہ تھا[1]۔ بادشاہ سب سے بڑا امیر ہوتا تھا۔ شاہی حقوق کو منوانے کے لیے وہ اپنے ساتھیوں یعنی بقیہ امیروں کا محتاج ہوتا تھا۔ نازک موقعوں پر بادشاہ ان کی رہنمائی اور مشورہ حاصل کرتا تھا۔ اگر وہ نالائق ثابت ہوتا تو معزول کر دیا جاتا تھا۔ اپنے مرتبے کے لحاظ سے وہ میر عدل اور مذہبی پیشواؤں کا صدر ہوتا تھا۔ عام مجلسوں میں عوام جمع ہو کر بادشاہ کے فیصلوں کی سماعت کرتے تھے۔ ان فیصلوں کو وہ اپنے امیروں کے مشورے سے صادر کرتا تھا۔ اگرچہ ایسی عام مجلس میں ان کے آگے پیش کردہ امور کے متعلق رضامندی یا نارضامندی کا اظہار کرنے کے سوا وہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے، تاہم ان کی رائے بہت وزنی ہوتی تھی کیوں کہ لڑنے والی جماعت کی بڑی تعداد انھی پر مشتمل ہوتی تھی۔ امیروں اور عوام کے بعد غلاموں کا درجہ تھا۔ یہ غلام یا تو لڑائیوں کے قیدی یا ان کی اولاد ہوتے تھے۔ غالباً ان غلاموں کا بڑا حصہ جنوبی قفقازی نسل سے تعلق رکھتا تھا جو مفتوحہ مینی آن سلطنت

---

[1] یونان میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی اصلی طبقہ کبھی نہیں رہا۔ بادشاہ اور امرا ایسے مذہبی فرائض کو زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ میں رکھتے تھے۔ بعض کو اور مقاموں پر اس قسم کا طبقہ انجام دیتا تھا۔ روم پر بھی یہی صادق آتا ہے۔

کے بانی تھے۔ یونانی امیروں اور ہندستانی چھتریوں، یونانی عوام اور ہندستانی ویشوں اور یونانی غلام طبقہ اور ہندستانی شودر طبقے میں ہم مماثلت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

شہری ریاست پہلے پہل یونان کے وحشی آریا فاتح کھلے قصبوں میں رہا کرتے تھے۔ ہر ایک قصبہ چند خاندان پر مشتمل ہوا کرتا تھا، لیکن زیادہ دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ ان نوواردوں نے اپنے مِنی آن پیش روؤں کی تقلید میں شہروں کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ یہ شہر یونانی تمدن کے گہوارے بن گئے۔ بعض لحاظ سے یہ تمدن دنیا کے موجودہ طرز تمدن سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔

یونانی شہر چھوٹے چھوٹے مقامات تھے۔ ان میں سب سے بڑا اور مشہور ترین شہر ایتھنز تھا۔ ایتھنز ہیلینی نسلوں یا قبیلوں میں سے ایک یعنی ایونی یونانیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن خود ایتھنز کی آبادی اس وقت بھی ڈھائی لاکھ سے آگے نہ بڑھ سکی جب کہ اس کی طاقت انتہائی عروج پر تھی اور اس کی تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اس آبادی میں آدھے کے قریب تو یقیناً غلام ہوں گے۔ دوسرے یونانی شہر بہت چھوٹے تھے۔ یہ ایک دوسرے کی آزادی پر بے انتہا رشک کرتے اور اکثر باہم جنگ وجدل میں مصروف رہتے تھے۔ اگر کسی مصیبت کے وقت جماعتوں یا اتحادیوں کی حیثیت سے متحد بھی ہو جاتے تو عام طور پر ایسے اتحاد ناقابل اعتماد اور عارضی ہوا کرتے تھے۔ علیحدگی پسندی کی روح جس نے بالآخر یونانی آزادی کا خاتمہ کر دیا، زیادہ تر اس حقیقت پر مبنی تھی کہ یونان بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور خطوں میں بٹا ہوا ملک ہے۔ ان اقطاع کو بلند کوہستانی یا وسیع سمندری گھاٹیوں نے ایک دوسرے سے اس طرح علیحدہ کر دیا

ہے کہ ان میں باہم تعلقات پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔

ان اختلافوں سے پیدا ہونے والے جھگڑوں کے باوجود، بنی نوع انسان کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ یونانیوں کو شاندار قوائے دماغی کے ساتھ ایسی سرزمین میں بسنے کا اتفاق ہوا جہاں ترقی کے قدرتی اسباب چھوٹی چھوٹی خود مختار شہری ریاستوں کی پیدائش کے باعث ہوئے کیوں کہ ایسے میں حقیقی تہذیب یعنی حریت اور خدمت کی روح نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہوتی اور پرورش پاتی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان چیزوں کے کامل ارتقا کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع دائرۂ عمل لازمی طور پر درکار ہوتا ہے۔ شہری ریاست میں لوگ متحدہ مدافعت، تجارت، اور دوسرے مقاصد کے لیے باہم مل جُل کر پوری جماعت کی بھلائی کی خاطر سرگرمی سے کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تاہم کوئی فرد ناواجبی طور پر مجبور نہیں کیا جاتا، جیسا کہ بڑی ریاستوں میں عموماً ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں حقیقی آزادی کے متحدہ تصور کو جڑ پکڑنے اور پھلنے پھولنے کا اتنا موقع ملتا ہے کہ وہ آیندہ پوری دنیا کے لیے قابلِ تقلید بن کر دُور دُور تک ایک اعلا تہذیب کی تعمیر میں مدد دے سکے۔

غالباً ہندستان کے وسیع میدانوں میں بھی ابتدائی زمانے میں آریائی شہری ریاستیں وجود میں آئی تھیں اور غالباً تمدن و حریت میں کافی بلند رتبے تک پہنچی تھیں۔ لیکن کھلی اور غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے یہ لڑائیوں میں تباہ ہو گئیں، یا ابتدا ہی میں بڑی بڑی سلطنتوں میں جذب ہو گئیں۔ ایسی سلطنتوں کے شدید مرکزی دباؤ نے فرد کے اندر آزادی اور خدمت گزاری کی روح کے نشو و نما پانے کو دشوار کر دیا۔

یونانی شہری ریاست کے باشندے اپنے آپ کو ایک مشترک مورث

اور بانی کی اولاد اور آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رشتہ دار تصور کرتے تھے۔
یہ لوگ اپنے شہر کے حسن و جمال، شہر کی عبادت گاہوں اور نفیس عمارتوں،
اس کے اداروں، اس کی آزادی، اس کے قدیم مشاہیر، اس کے محافظ دیوی
دیوتاؤں اور اس کے گزشتہ مشہور کارناموں پر بڑا فخر کرتے تھے۔ اپنے شہر
کے لیے لڑائی میں وہ اپنی جانیں خوشی سے نثار کر دیتے تھے۔ اس کے لیے
وہ جیتے، اسی کے لیے کام کرتے اور اسی کے لیے اپنے خاندانوں کی پرورش
کرتے تھے۔ اسی طرح ہر ایک یونانی کے تمام محرکات اور اس کی سرگرمیاں
نہایت وفاداری کے ساتھ شہر کی خدمت کے لیے وقف رہتی تھیں۔ وہ
اپنے جان و دل کے ساتھ شہر کی خدمت کرتا تھا۔ ایتھنز اور جمہوری نظامِ حکومت
رکھنے والے دوسرے شہروں میں شہریوں نے اسی جذبۂ آزادی کے ساتھ
ان کی خدمت کی۔ یہ جذبۂ آزادی کئی لحاظ سے آزادی کے اس جذبے سے
کہیں قوی تر تھا جو دورِ حاضرہ کے وسیع ترین دستوروں کے تحت حاصل کیا
گیا ہے۔[1] اس طرح یونانی شہری ریاست اگرچہ چھوٹی ہوتی تھی اور اس کے
اغراض و مقاصد اکثر نہایت محدود ہوتے تھے، تاہم وہ حقیقی تہذیب کا گہوارہ
تھے۔ یہ ریاست ساری دنیا کے لیے اس بات کی مثال تھی کہ کس طرح عملی
اداروں اور نہایت اچھی طرح وضع کیے ہوئے قانون کے ذریعے ایسی تہذیب
کی نشو و نما اور تکمیل ہو سکتی ہے۔

شہری ریاست کی حکومت

شہری ریاستوں کے ارتقا کے ساتھ ہی قدیم بادشاہتیں بیش تر فنا ہو گئیں۔

---

[1] یہ بات یاد رہے کہ ایتھنز کے باشندوں کا ایک مختصر سا حصہ ہی "شہری" ہوتا تھا اور
اسی کو سیاسی حقوق حاصل تھے۔ باقی عورتیں، غیر ملکی، غلام وغیرہ تھے۔

سلطنت کے امیروں کی قوت بادشاہوں سے زیادہ بڑھ گئی اور انھوں نے یک بیک یا رفتہ رفتہ حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح تقریباً تمام شہروں کو اشرافی دورِ حکومت سے گزرنا پڑا۔ ان میں صرف امیر ہی حکومت میں کوئی عہدہ پانے کے مستحق ہوتے تھے۔ لیکن امرا اپنے اقتدار کو خود غرضانہ مقاصد میں استعمال کرنے لگے۔ یہ لوگ اپنے نسب، اپنی دولت اور اپنے مرتبے پر حد سے زیادہ مغرور تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ سست کاہل اور عیاش بھی ہوتے گئے۔ انھوں نے ظالمانہ قوانین اور خاص کر ظالمانہ قرضوں کے بوجھ سے غریب شہریوں پر بہت مظالم ڈھائے۔

"غریب طبقوں کے مرد، عورتیں اور بچے امیروں کی پوری غلامی میں تھے .... پیداوار کے چھٹے حصے کے معاوضے میں یہ لوگ امیروں کی زمین کی کاشت کیا کرتے تھے۔ تمام ملک صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ اگر کاشت کار زرِ لگان کی ادائی سے قاصر رہتے تو اپنی اولاد کے ساتھ غلامی کے لیے پکڑ لیے جاتے تھے۔ ان کی ذات قرض دینے والوں کے پاس رہن ہوتی تھی .... لیکن عوام کی حالت کا بدترین اور تلخ ترین چیز یہ حقیقت تھی کہ ان عہدوں میں جو دستور کے تحت قائم کیے گئے تھے، ان میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ .... حیثیت مجموعی کہا جاتا ہے کہ کسی چیز میں بھی ان کا کوئی حصہ یا کوئی دخل نہ تھا"[1]

اس طرح اکثر یونانی شہروں میں رفتہ رفتہ ایک دوسرا تغیر پیدا ہوا۔ امیر خاندانوں کو جبراً یا تدریجی قانون سازی کے ذریعے اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ یہ امیر خاندان وہ تھے جو اکثر صورتوں میں پہلے ہی عیش پسندی کی بدولت نہایت

---

[1] ارسطو کی کتاب "دستورِ ایتھنز" پانچواں باب۔

درجے کم زور ہو چکے تھے۔ بعض وقت عوام کی بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر کوئی
شخص اٹھ کھڑا ہوتا تھا، اور عوام کی مدد یا کبھی ایسے دولت مندوں کی اعانت
سے جن کا تعلق امیر طبقے سے ہوتا تھا، اشرافیہ کو نکال باہر کرتا تھا۔ ایسا شخص جب
کام یاب ہو جاتا تو خود اشرافیہ کی جگہ حکومت کرنے لگتا تھا۔ ایسے انفرادی حاکم
"مطلق العنان" کہلاتے تھے۔ ان کے دربار اکثر شان دار ہوا کرتے تھے اور
یہ فنونِ لطیفہ، شاعری اور سائنس کے سرپرست ہوتے تھے۔ چناں چہ یہ واقعہ
ہے کہ یورپی تمدن بہت کچھ یونانی مطلق العنانوں کا زیر بار منت ہے۔ لیکن ان
کی حکومت استبدادی اور خود غرضانہ ہوتی تھی۔ عموماً یہ دوسری ریاستوں کو
فتح کر کے بڑی سلطنتیں قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ اس طرح کے
حملوں سے انھوں نے یونانی ذہنیت کو ناخوش کر دیا۔ یونانی ذہنیت تو خود مختار
شہری ریاست کی پرجوش حامی تھی۔ اس طرح جلد یا بدیر اکثر یونانی ریاستوں
میں ایک عام بے اطمینانی نے ایک دوسرا تغیر پیدا کیا۔ عوام اٹھ کھڑے ہوئے
انھوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح جمہوریت
قائم کر دی۔

ایتھنز کی جمہوریت

یونانی جمہوریت میں عوام کی حکومت خود عوام ہی کے ذریعے "راست" ہوا کرتی تھی یعنی شہری
عام اسمبلی کے لیے اپنے نمایندوں کا انتخاب نہیں کرتے تھے، جیسا کہ دورِ حاضرہ
کی جمہوریتوں میں ہوا کرتا ہے[1] بلکہ ہر شہری یہ حق رکھتا تھا کہ خود اسمبلی میں شریک
ہو کر اس کے کام میں حصہ لے۔ اس طرح یہ لوگ قوانین بناتے، عہدہ داروں
اور مجسٹریٹوں کا انتخاب کرنے اور خارجی تعلقات کا تصفیہ کرنے میں مدد دیا

۱۔ ملاحظہ ہو صفحہ   کا حاشیہ۔

کرتے تھے۔ ایتھنز میں ہر شہری کو ریاست کی مجلسِ عاملہ کی رکنیت اور تمام
اعلا ملکی اور فوجی عہدوں کا حق حاصل تھا۔ شہریوں کو ایتھنز کی اسمبلی اور
قانونی عدالتوں میں شرکت کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ قانونی عدالتوں میں
ان کی نشست ججوں کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنز اور
دوسرے مقاموں میں کچھ عرصے کے بعد راست جمہوریت پر زوال آنے لگا۔
اس کی جگہ ایسی حکومت لینے لگی جس میں شہریوں کے کاہل اور فلاکت زدہ عناصر
حصہ لینے لگے۔ ایسے لوگوں کے پاس کوئی کام نہ ہوتا تھا، اور یہ اسمبلی یا کونسل کی
رکنیت یا قانونی عدالتوں کی ججی کے خواہاں ہوتے تھے کیوں کہ ان کا معاوضہ
آسانی سے مل جاتا تھا۔ لیکن یہ بعد کا تنزل اور انحطاط تھا کیوں کہ ایتھنز کی جمہوریت
ڈیڑھ سو سال کے دوران میں نہایت طاقت ور اور شان دار رہی۔ اسمبلی میں
قومی کام کرنے اور پبلک عہدوں پر فائز ہونے کو ریاست کے بہترین افراد
انتہائی اعزاز سمجھتے تھے۔ اس عہد کے دوران میں ایتھنز نے حیرت انگیز فضل
و کمال کا مظاہرہ کیا۔ ڈرامے میں، مجسمہ سازی میں، فنِ تعمیر میں، فلسفے میں،
تاریخ میں، خطابت میں، سیاست میں، یہ عہد آج تک روشنی کے مینار کی
طرح درخشاں ہے اور اعلا و مکمل تہذیب کے دشوار گزار راستے میں انسانیت کی
رہ نمائی کرتا ہے۔ ایتھنز نے وقتی طور پر اس مسئلے کو حل کر دیا تھا کہ کس طرح ہر
انفرادی شہری کو ایسی صحیح تربیت اور موقع دیا جائے کہ اسے ہر طرف سے اپنی
فطرت کو ترقی دینے کا موقع ملے، اور وہ پوری آزادی اور پوری تن دہی کے ساتھ
ریاست کی خدمت انجام دے سکے۔ قانون کے آگے ہر ایک شہری مساوی
حیثیت رکھتا تھا۔ حکومت کے کاموں میں یہ پوری ذمے داری قبول کرتا تھا
اور ان مشہور و شان دار تہواروں اور ڈرامائی تماشوں میں شریک ہو سکتا تھا جو

کے لیے نادار شہریوں کو مفت اجازت نامے دیے جاتے تھے۔ یہ سب چیزیں پوری جماعت کے لیے تعصب تعلیم کا کام دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ نہ صرف ایتھنز کے ہر شہری کو اپنی عمر میں کسی نہ کسی وقت قومی کاموں میں حصہ لینے اور پبلک عہدوں پر فائز ہونے کا موقع ملتا تھا، بلکہ اس کے شہر کی روح اور ادارے اس کو ہمیشہ اکساتے رہتے تھے کہ وہ اپنے اعلا جوہر کو پوری طرح ترقی دے تاکہ وہ اپنی پوری قابلیت اور اہلیت کے ساتھ ایتھنز کی خدمت انجام دے سکے۔

ایتھنز کے انتہائی عروج اور شان وشکوہ کے زمانے میں جماعتی فلاح وبہبود کے لیے ذمے دار، ترقی، اور تکمیلِ ذات کی روایت ایک ایسی چیز کے ساتھ متحد ہوگئی، جس کی یونانی بدرجۂ اتم ستایش کرتے تھے۔ یہ پاکیزگی، معقولیت اور خردمندی کی روح تھی جو ایک جماعت کے دوسری جماعت پر ظلم وزیادتی یا جبر میں مانع اور فرقہ وارانہ تلخی میں مزاحم ہوتی تھی۔ پرک لیز جیسے سیاس کے الفاظ میں جس نے ایتھنز کی تیس سالہ انتہائی عظمت کے زمانے میں اس کی رہبری کی تھی:

"یہ صحیح ہے کہ ہم ایک جمہوریت کہلاتے ہیں، کیوں کہ ہمارا انتظامِ حکومت صرف چند کے نہیں بلکہ بہت سوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جہاں قانون خانگی جھگڑوں میں مساوی اور ایک انصاف کا ضامن ہے، اس کے ساتھ ہی وہاں اس کی خوبی کا دعوا بھی مسلّم ہو جاتا ہے۔ جہاں ایک شہری کسی حیثیت سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے تو اس کو کسی پبلک خدمت پر مامور کردیا جاتا ہے۔ یہ خدمت استحقاق کے طور پر نہیں بلکہ قابلیت کے انعام کے طور پر عطا کی جاتی ہے۔ افلاس بھی کوئی سدِراہ نہیں، ایک شخص خواہ وہ کیسی ہی گم نامی کی حالت میں کیوں نہ ہو، اپنے ملک کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ہماری پبلک زندگی میں کوئی افتراق نہیں .... ہمارے پبلک کاموں کے ساتھ احترام کی ایک روح وابستہ ہے۔ قانون

اور اقتدار کے احترام نے ہم کو گمراہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ ہم ان قوانین کا بھی خاص لحاظ رکھتے ہیں، جو اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ ان سے ستم رسیدوں کی حفاظت کی جائے۔ ہم ایسے غیر مکتوبی قوانین کا بھی احترام کرتے ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا عام طور پر ہدفِ ملامت بنتا ہے۔[۱۵]"

قوانین

یہ مہتم بالشان الفاظ ہم کو ایک اور امر کی طرف متوجہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے تہذیب کے ارتقا میں یونانی اثر سب سے زیادہ اہم رہا ہے۔ ایتھنز کا ہر باشندہ اپنے شہری قوانین کا گہرا احترام کرتا تھا۔ ان قوانین کو وہ بحیثیتِ مجموعی نہ صرف دولتِ عامہ کے لیے بلکہ خود اپنی ذاتی آزادی اور آسودگی کے لیے تقریباً مقدس محافظ سمجھتا تھا۔

ایتھنز میں پہلا مکتوبی مجموعہ قانون ساتویں صدی قبل مسیح میں ڈراکو نامی امیر نے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ قانون کے متعلق مشہور ہے کہ یہ نہایت سخت اور جابرانہ تھا۔ مگر اس کی تفصیلات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں ایک دوسرا بہت زیادہ اہم مجموعہ قانون، مقننِ اعظم سولن نے مرتب کیا۔ غریب طبقے جس کچل ڈالنے والے قرض کے بوجھ سے عرصہ دراز سے نالہ و فریاد کر رہے تھے، یہ بوجھ ان کے دوش سے ہلکا کیا گیا۔ مدبرانہ معاشی اور سماجی اصلاحات کی گئیں، تاکہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ بوجھ ان پر پھر کبھی نہیں ڈالا جائے گا۔ پھر ایک وسیع پیمانے پر اور زیادہ جمہوری طریقِ حکومت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ عہدے کے لیے نسب کو نہیں بلکہ دولت کو معیار قرار دیا گیا۔ ان سب باتوں سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ تمام شہری ایک اسمبلی کے رکن بنا دیے گئے۔ اس اسمبلی کے آگے عہدے دارو

---

۱۵ تھیوسی ڈی ڈس، باب دوم صفحہ ۳۷۔ ترجمہ از جووٹ۔

کو عہدے کی مدت ختم ہونے پر اپنے طرزِ عمل کی جواب دہی کرنی ہوتی تھی۔ اس مجلس میں دوسرے اہم معاملے بھی فیصلے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔

چھٹی صدی کے آخر میں ایتھنز کے دستور کو ایک تیسری اہم ترقی دی گئی، یعنی کلی از تقنینِ قانون مدوّن کیا گیا۔ اس ضابطۂ قانون نے مکمل اور راست اور جمہوری طرزِ حکومت کو مستحکم کر دیا۔ اس قسم کی حکومت کی پہلے سے داغ بیل پڑ چکی تھی۔ اس مجموعۂ قانون سے اس بات کی ضمانت ہو گئی کہ آیندہ سے ایتھنز میں کوئی امتیازی ذات یا کوئی جماعت نہ ہوگی، دفتری قسم کا کاروبار نہ ہوگا، پیشہ ور سیاسیوں کا گروہ نہ ہوگا، بلکہ تمام لوگ مساوی طور پر مملکت کے مخدوم اور خادم ہوں گے حقیقی جمہوری حکومت کے لیے احتیاط سے مرتب کیے ہوئے قواعد اور اس کے طریقِ عمل کے تحت ایتھنز اپنی آزادی اور عظمت کی انتہائی بلندی پر پہنچ گیا۔ اس لیے اہلِ ایتھنز کے دلوں کا اس دستور کے احترام سے معمور ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اسی دستور کے وہ بہت زیادہ ممنون تھے اور "قوانین اور اقتدار کے احترام کی بدولت غلط کاری سے باز رہتے تھے"۔ پبلک کاموں اور نظم و نسق میں غیر دستوری طرزِ عمل کے روکنے کے مکمل تحفظات مہیا کر دیے گئے تھے۔ قانون سازی اور عدل گستری کے مسلسل ذاتی تجربے نے ایتھنز کے ہر معمولی سمجھ رکھنے والے باشندے کو اپنے محبوب دستور کی حرمت کا تیز نظر اور ہوشیار محافظ بنا دیا تھا۔

اس طرح دنیا میں دستوری قانون کا خیال پیدا ہوا۔ ایتھنز ہی میں لوگوں نے یہ بات سیکھی کہ قانون نہ کوئی شاہی فرمان ہے نہ کسی امیر یا کسی عہدے دار کا حکم ہے اور نہ کسی بڑے اور روایتی مقنن کی تالیف ہے۔ اس کو پوری جماعت کا ایسا مظہر تسلیم کرنا چاہیے جو اس جماعت کی آزادی اور مساوات

کے کامل تحفظ کا یقین دلاتا ہو۔ ایتھنز میں قانون کا احترام اس لیے کیا جاتا تھا کہ وہ سیاست اور افراد دونوں کی آزادی کی حفاظت کرتا تھا۔ ہر آدمی کو بہ حیثیت مجموعی پورے شہر کو بافراغ زندہ رہنے اور ایک روشن خیال زندگی بسر کرنے کا موقع عطا کرتا تھا۔

ایرانی حملے

دارایوشس اوّل (۵۲۱ سے ۴۹۶ ق م) کے عہد میں ایران کی عظیم الشان مملکت یونان اور یونانی سمندروں کے مشرق سے لے کر دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر خود یونانیوں کے دُور کے رشتے دار آریا حکومت کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کی غیر معمولی وسعت، اس کا استبدادی طرزِ حکومت، اور اس کی حاصل کردہ ادنا درجے کی تہذیب غرض ان سب چیزوں نے اسے اور اس کے اداروں کو یونانی کیفیات سے بالکل اجنبی رکھا۔ ایرانی حکومت نے اپنی بڑی بڑی فوجیں اور زبردست بحری بیڑوں پر بحر وساکرے کے مغربی سمت سے یونان پر بڑے بڑے حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونان جیسے غریب چھوٹے اور منقسم مُلک کی کامل تباہی مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ یہ ایرانی پیش قدمی ان ناقابلِ مقاومت نقلِ وطن کی مہموں کی ایک کڑی تھی، جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

سب سے پہلے لائی ڈیاں نامی سلطنت فتح کرکے برباد کر دی گئی۔ اس سلطنت پر ایک غیر آریائی جماعت حکومت کرتی تھی۔ اس کا دارالحکومت سارڈس تھا۔ یہ ریاست یونان اور ایران کے درمیان ایک سدِّ راہ کی طرح حائل تھی۔ اس کے بعد ایشیائے کوچک میں ملی ٹیس جیسے عظیم الشان شہر کی سخت مزاحمت کے باوجود یونانی مطیع کر لیے گئے۔ آخر کار ۴۹۰ق م میں دارا کے عہد میں ایرانی فوج چھ سو جہازوں میں سوار ہو کر خاص یونان کی طرف روانہ ہوئی۔

ایتھنز اور اسپارٹا یونان کے اہم ترین شہر تھے۔ ان شہروں کو سفیروں کے ذریعے اطاعت قبول کر لینے کی دعوت دی گئی لیکن انھوں نے سفیروں کو قتل کر کے اس دعوت کا جواب دے دیا۔ اس توہین کا خونی بدلہ لینے کے لیے ایرانی براتھان نامی مقام پر اُتر پڑے۔ یہ مقام ایتھنز سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ایرانیوں نے اپنے آپ کو ایتھنز کی ایک چھوٹی سی فوج کے مقابل پایا۔ اس فوج میں نو ہزار اہلِ ایتھنز شریک تھے۔ اس عظیم اور یادگار لڑائی میں ایرانیوں کے انبوہِ کثیر کو یونانیوں کی شجاعت اور تنظیم نے شکستِ فاش دے دی۔ اس فتح کے نتائج بہت وسیع اور دُور رس نکلے۔ ایک چھوٹی سی شہری ریاست کی آزاد جمہوریت نے ایک استبدادی وسیع سلطنت سے مقابلہ کر کے اس پر مکمل فتح پائی تھی۔ اس فتح نے یہ اصول ثابت کر کے دکھایا کہ جس طرح شہری کو اپنے ہی طریقے پر ریاست کی خدمت کے لیے آزاد رہنا چاہیے، اسی طرح پوری ریاست کو بیرونی اقتدار سے آزاد رہنا چاہیے۔ خود مختاری یعنی حکومتِ خود اختیاری کو شہنشاہیت[1] کے مقابلے میں پوری پوری فتح حاصل ہوئی۔

دس سال بعد کسریٰ (خشیار یاشا) کے عہد میں ایرانیوں نے پھر یونان پر حملہ کیا۔ اب کی بار خشکی اور تری دونوں طرف سے حملہ کیا گیا تھا۔ ایک زبردست فوج نے درِ دانیال کو عبور کیا۔" اس فوج میں بالائی مصر کے حبشی شیر کے چمڑوں میں ملبوس، جنگی رنگ لگائے، کمان، لٹھ، اور تبر سے مسلح شریک تھے۔ آشوری پورے زرہ بکتر سے آراستہ، ہندستانی تیر انداز روئی کے لباس میں ملبوس، اہلِ لیبیا چمڑے لپیٹے آگ پر سخت کی ہوئی لکڑی کے واحد ہتھیار کے

---

[1] شہنشاہیت کی مختصر تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ کئی ریاستوں پر ایک ریاست کی حکومت ہے اور اس کا مقصد ذاتی مفاد اور نام آوری ہے۔

ساتھ، تھریسی ہرن کے جوتے پہنے اور لومڑی کا چمڑا سر پر ڈالے، سی تھین جنگی تبر لگائے اور بلوچی گھوڑوں کے سروں پر بنائی ہوئی خود جن پر یال لہراتی تھی، پہنے ہوئے اس فوج میں شامل تھے۔ ایرانی سپہ سالاروں کے تحت پینتالیس مختلف قوموں پر مشتمل پیدل فوج تھی۔ ان سب کے علاوہ اسّی ہزار کی ایک طاقت ور سوارہ فوج، اونٹوں کا دستہ اور رتھیں بھی تھیں[1]۔ اگرچہ یہ گمان غالب ہے کہ یونانیوں نے دشمن کی تعداد میں بہت مبالغے سے کام لیا ہوگا، پھر بھی صرف پیدل فوج کی جملہ تعداد بیس لاکھ بیان کی گئی ہے۔ ان حملہ آوروں کے انبوہ کثیر کی کمک پر بارہ سو بڑے اور تین ہزار چھوٹے جہازوں کا بحری بیڑہ تھا۔ اس بیڑے کے ہر جہاز پر دو، دو سو سے زیادہ آدمی سوار تھے۔

یونانیوں نے سات ہزار آدمیوں کے ساتھ دیر یا تانی لی کے تنگ درے پر اس زبردست اور بوقلموں لشکر کا جم کر مقابلہ کیا۔ یہ درہ سمندر اور پہاڑ کے درمیان عین یونان خاص کے مقام داخلہ پر واقع ہے۔ یہاں ایک دوسری دائمی یادگار لڑائی لڑی گئی۔ اس لڑائی میں لے ونڈاس اور اس کی چھوٹی سی فوج نے ایرانیوں کو ایک ہفتے تک روکے رکھا، یہاں تک کہ اس کے پیچھے یونانیوں نے منظم طور پر مدافعت کا انتظام کر لیا۔ ایرانیوں نے جب پہاڑ کے اطراف درے کے عقب میں راستہ نکال لیا تو تین سو اسپارٹی بعض حلیفوں کے ساتھ ان کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور پسپا ہونے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ان کا آخری آدمی تک مارا گیا۔ اس طرح ان لوگوں نے غیر فانی شہرت حاصل کر لی۔ ان کا یہ ایثار اکارت نہ گیا۔ یقیناً ایرانی یونان میں آگے بڑھ آئے تھے، مگر ان کی ہمت پست ہو چکی تھی۔ اس دوران میں یونانی فوجیں

---

[1] تاریخ یونان صفحہ ۱۱۶ مصنفہ اڈمنڈ سن عثمان

جمع ہو گئیں، اور تین سواحل اسپارٹا کی بہادرانہ مثال سے ان کے دل بڑھ گئے
تھے۔ یونانیوں نے جن میں بیشتر اہلِ ایتھنز شامل تھے، ایرانی بیڑے کا
مقابلہ کیا اور خود کسریٰ کی آنکھوں کے سامنے سلامس کے مقام پر اسے
شکست دے دی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی بحری لڑائی تھی جو تنظیم اور ملاحی
میں تفوق کے ذریعے جیتی گئی۔ خود ایتھنز کو پہلے ہی سے جلا دیا گیا تھا، لیکن
ایرانیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کیا گیا، اور آخر کار ان کی فوج پلیٹیا کے مقام پر
تباہ کر دی گئی۔

اس کے بعد یونان پر کسی ایرانی حملے کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔ چھوٹی،
مفلس اور منقسم ہونے کے باوجود آزاد یونانی ریاستوں نے ایک زبردست اور
ظالم حریف کی گرفت سے اپنی گلو خلاصی کر لی۔ یہ دشمن وہ تھا جس کے پاس
ان گنت فوجیں اور وسیع ذرائع موجود تھے۔ ایسا کر کے انھوں نے اجنبی شہنشاہیت
کے مقابلے میں خود مختاری کی مثال قائم کر دی۔

سقراط

غالباً سب سے بڑا آدمی جو یونان ——— یعنی وہ ملک جس کی تہذیب بعض
لحاظ سے دنیا کی اعلا ترین تہذیب تھی ——— کے سب سے بڑے شہر
ایتھنز میں پیدا ہوا، وہ سقراط (۳۹۹ ـ ۴۶۹ ق، م) نامی ایک غریب اور
بد قطع بدتراش تھا۔ تقریباً اپنے تمام ہم شہریوں کی طرح وہ بھی پبلک عہدوں
پر فائز رہا، اور غیر معمولی طور پر کردار کی مضبوطی اور آزادہ روی دکھلائی۔
ان سے ہٹ کر اس نے اپنی زندگی حقیقی صداقت اور خیر کی جستجو کے لیے
وقف کر دی۔ مقبولِ عام مشاہیر اور عام متداول آرا پر کھلی تنقید کر کے اس نے
بہتوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اس نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت بھی تیار
کی تھی۔ اس جماعت میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مفکرِ اعظم افلاطون بھی تھا۔

بنی نوعِ انسان کو جس شخص نے پہلی مرتبہ واضح اور باقاعدہ طور پر فکر کرنا سکھایا، وہ استاد یا شاگرد دونوں میں کوئی ایک ہے۔

لیکن سقراط کی انتہائی عظمت کا راز اس کی موت میں پوشیدہ ہے۔ اس کے بعض دشمنوں نے اس پر بداخلاقی اور بے دینی کی تعلیم دینے کا الزام لگا کر اسے سزا دلائی۔ اس کی بے گناہی بالکل واضح تھی، اور ممکن تھا کہ وہ ان متعدد ناجائز طریقوں میں سے کسی ایک کو کام میں لاتا جو اس زمانے میں بالکل عام تھے، تو سزا سے بچ جاتا۔ مثلاً ججوں کی خوشامد یا قید خانے کے محافظ کو رشوت دینا۔ لیکن اس نے اپنی خودداری اور اخلاقی استواری کی بنا پر ایسی کسی حرکت کے ارتکاب سے قطعی انکار کر دیا۔ اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس نے صرف اپنی بے گناہی کا اظہار کیا، اور اس بات پر اصرار کیا کہ جس بات کو وہ حق سمجھتا تھا، اس کے اعلان اور اس کی تلقین کا اسے حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ انسانی احکام کی اطاعت کے بجائے خدائی آواز پر لبیک کہنا چاہیے، چاہے یہ احکام خود اُن کے محبوب شہر ایتھنز کے شہری قانون سازوں ہی کے نافذ کردہ کیوں نہ ہوں۔ ایتھنز کے پانچ سو ایک ججوں کے سامنے اس نے جو سیدھا سادا اور پُرمغز جواب دیا وہ یہ تھا:

"اگر آپ یہ خیال کرتے ہوں کہ ہر شخص کو، خواہ وہ کسی درجے کا ہو، موت وحیات کے موقعوں کو پیشِ نظر رکھ کر کام کرنا چاہیے، یا کسی کام کو کرتے وقت صحت یا غلطی کے امکان، یا ایک بھلے یا بُرے آدمی کی طرح کام کرنے کے سوا کسی اور بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، تو آپ نے بڑی غلطی کی۔۔۔۔۔۔ اے اہلِ ایتھنز! مجھ کو تمھارا بے حد پاس و لحاظ ہے، اور مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ لیکن میں خدا کی اطاعت کو تمھاری اطاعت پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور جب

تک میرے دم میں دم اور میرے جسم میں قوت ہے، میں تلاشِ حق سے اور حق کو تم پر واضح کرنے سے کبھی باز نہیں رہوں گا۔ تم میں سے جس کسی سے بھی ملوں گا، اپنی عادت کے مطابق اس سے کہوں گا "میرے محترم دوست! تم ایتھنز کے شہری ہو، جو ایک بہت ہی عظیم الشان شہر ہے، اور اپنی دانائی اور قوتِ ذہنی کے لیے مشہور ہے۔ کیا تمھیں دولت جمع کرنے اور شہرت و اعزاز حاصل کرنے کی اس درجہ فکر سے شرم نہیں آتی؟ کیا تم کو دانائی، صداقت، اور تہذیبِ نفس کا کچھ بھی خیال اور فکر نہیں؟ .... دُنیا میں ایسا کوئی آدمی نہیں جو مجھ کو موت کے ڈر سے بُرائی کرنے پر آمادہ کر سکے، مگر میں بُرائی پر آمادہ ہونے سے پہلے فوراً مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔"

موت کا فیصلہ سُنایا گیا تو سقراط نے کہا:

"نیک آدمی کا کچھ بگڑ نہیں سکتا، نہ زندگی میں نہ مرنے کے بعد۔"[1]

ضمیر کی آزادی

سقراط نے اہلِ ایتھنز کے ہاتھوں اس شان سے اپنی جان دی کیوں کہ ایتھنز کی انتہائی عظمت کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اس طرح سقراط نے دُنیا کے آگے اپنے ملک کی کم و بیش اسی قسم کی مثالوں سے کہیں زیادہ قابلِ قدر مثال پیش کی۔ سقراط نے فکر کی آزادی، تقریر اور عمل کی آزادی پر اپنی جان قربان کر دی۔ اپنے ضمیر کے مطابق سوچنے، بولنے اور عمل کرنے کا ہر شخص کا حق عین حق اور اس کا فرض ہے۔ اس نے آزادیٔ ضمیر کے لیے جان دی۔ جس صداقت کے لیے اپنی جان دی اسے اس بنیاد پر قائم کیا کہ ہر شخص پر خُدا کی آواز کی اطاعت فرض ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو خُدا کی طرف سے اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس عمیق تر آزادی کے بغیر ہر قسم کی دوسری

---

[1] افلاطون کی کتاب "سقراط کی تائید میں" کا ترجمہ منجانب کلیسا۔

آزادیاں، حتیٰ کہ جمہوریت، قانونِ مساوات اور ریاستی خود مختاری محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ گنتی کے چند قائدوں اور پیغمبروں پر ایک بے بصیرت اکثریت کا کورانہ ظلم ہوگا۔ یہ قائد اور پیغمبر وہ لوگ ہیں جو اپنے اتباع کرنے والوں کو انسانی ترقی اور کمال کے ایک بہتر اور دور کی طرف رہبری کرتے ہیں۔

یونان کا زوال

ایتھنز کے باشندوں کی ایک مہلک کمزوری کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔ اس کی راست جمہوریت حکومت کے لیے بے کار مفلسوں کا ایک گروہ تیار کرنے سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔ دوسری کمزوری کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تہذیب و تمدن کی بنیاد غلامی پر رکھی گئی تھی۔ ایتھنز کے شہری کی آسایش اور آزادی اس کے غلاموں کی مشقت اور فرماں برداری کی رہینِ منت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ایتھنز بہت جلد ایک ہوس کا شکار ہو گیا۔ اور اس ہوس نے جب کبھی سر اٹھایا ہے دنیا کی تقریباً ہر ایک قوم کو تباہ و برباد کیا ہے۔ یہ ہوس تھی اپنی مرضی کو دوسروں سے منوانے کی، اور دوسروں کی آزادی کو محدود و پابند بنانے کی۔ ایک ایسی ایتھنزی سلطنت قائم کی گئی جس کے اقتدار کے تحت بہت سی دوسری یونانی ریاستوں پر محصول عائد کیے گئے۔ ان ریاستوں کو لوٹا گیا تاکہ ایتھنز کی عمارتیں اور کھیل تماشے شہر کی شان و شوکت کو چار چاند لگائیں اور محصولوں اور لوٹ سے ایتھنز کے شہری ڈرامائی کھیلوں میں مُفت داخل ہو سکیں۔ اسمبلی اور عدالتوں میں شرکت کا معاوضہ انھی سے ادا کیا جائے، بلکہ شہریوں کے لیے انھی سے کھانے پینے کا مُفت انتظام کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایتھنزی شہنشاہیت کو عروج ہوا اور ایرانی شہنشاہیت کی طرح اس نے ماتحت ریاستوں کی آزادی چھین لی۔ اس کی وجہ سے ایتھنز سے عام نفرت پھیل گئی۔ اور آخرکار اس کو ایک

طویل جنگ میں شکست اٹھانی پڑی۔ اس جنگ کی بہترین یادداشت ہمیں زبردست یونانی مورخ تھے۔ سی اُڈی ڈس کی تاریخ کے اوراق میں ملتی ہے۔

یونانی شہری ریاستوں میں ایک دوسرے سے شدید رشک و حسد کی بنا پر ایسا افتراق پیدا ہو گیا تھا کہ یہ اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ ان کو آپس میں متحد کر کے ایک مستحکم مرکزی وفاقی حکومت بنائی جاسکتی۔ مختلف جماعتوں اور پارٹیوں کے آپس کے اندرونی جھگڑوں سے بڑی ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ اگر ایسے وقت میں قریب کی کوئی منتظم اور طاقت ور قوت اٹھ کھڑی ہوتی تو یکے بعد دیگرے ان سب کو فتح کر لینے سے کوئی چیز اسے روک نہ سکتی تھی۔

سکندر ۳۳۸ ق۔م کے قریب شاہ فلپ کے عہد میں مقدونیہ کی شہنشاہی قوت کو جنگ چیرونیا کے بعد سے عروج حاصل ہونے لگا۔ اس نے آخر کار تمام آزاد یونانی ریاستوں کو ہضم کر لیا۔ ڈیموس تھینز جیسا زبردست خطیب اور "بعض لحاظ سے یونانی تحریکِ آزادی کا آخری اور سب سے اولوالعزم حامی" اپنے ہم شہریوں کو ان کی قسمتِ منتظرہ پر عبث متنبہ کرتا رہا، اور یونانیوں کو متحد کر کے ایک منظم مقابلہ کرنے کی بے سود لیکن جان توڑ کر کوشش کرتا رہا۔

اس کے بعد سکندرِ مقدونی کے درخشاں شہابی دور کا آغاز ہوا۔ سکندر نے ایران کی وسیع سلطنت کو بالکل تباہ و برباد کر دیا، اور اس کی انتہائی حدیں پار کر کے ہندستان تک جا پہنچا۔ اس نے ایرانی سلطنت کی جگہ ایک عظیم الشان یونانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سکندر اگر اور دس سال زندہ رہتا تو

قانون اور حکومت کا وہ طرز ایجاد کرتا جو آزاد تہذیب کے یونانی تصورات کے سانچے میں ڈھلا ہوتا، اور ایک عظیم الشان عالم گیر سلطنت کے انتظام کے لیے موزوں ثابت ہوتا۔ چناں چہ اس نے ایشیا میں دُور دُور تک یونانی نوآبادیاں قائم کیں۔ یہ نوآبادیاں یونانی تمدن کا مرکز اور تجارتی منڈیاں بن گئیں۔ ان سب چیزوں سے بڑھ کر اس نے اپنے بعد انسانی دلوں پر عالم گیر سلطنت یعنی عالمی ریاست کا گہرا نقش چھوڑا۔ سکندر کی عالمی مملکت اگر وجود میں آتی تو یہ ظالمانہ شہنشاہی نہ ہوتی۔ یونانی شہروں کے ساتھ اس کا یہ سلوک کہ وہ پوری طرح خود مختار چھوڑ دیے گئے تھے، ثابت کرتا ہے کہ اس کی ذات میں کتنی زبردست صلاحیت تھی۔ ان قوموں اور ریاستوں پر جو اس کی سلطنت میں شامل تھے، مرکزی حکومت قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ انھیں انتہائی امکانی حد تک حکومتِ خود اختیاری دینا چاہتا تھا۔ ۳۲۳ ق۔م میں ۳۲ سال کی عمر میں اس کی جواں مرگی نے اس کی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہ دنیا کا ایک زبردست المیہ ہے۔

سکندر کے کام کے جس حصّے کو سب سے زیادہ بقا نصیب ہوئی وہ غالباً اسکندریہ کے عظیم الشان شہر کا بسانا ہے۔ یہ وہ شہر ہے جو ایک ہزار سال تک یونانی علم اور تہذیب کا گہوارا، اس کی جامعہ اور سائنس و ایجادات کا ایک عظیم الشان محل اور کارخانہ بنا رہا۔

یونانی سائنس

افلاطون (۴۲۹ سے ۳۴۷ ق م) سقراط کا نامور شاگرد تھا۔ یہ خود نہ صرف ایک زبردست مفکر گزرا ہے بلکہ ایک زبردست مصلح بھی ہوا ہے۔ اس نے انسانی زندگی کے لیے ایک نئی تجویز پیش کی اور ایک تصوری ریاست یا "اٹوپیا" کا خاکہ پیش کیا۔ ایسی ریاست کا انتظام اور حکومت

عقلِ صحیح اور حقیقی انصاف کے مطابق رکھی گئی ہے۔ اگرچہ افلاطون کی یہ تصوری جمہوریت یونانی شہری مملکت کے تنگ دائرے میں محدود تھی، تاہم اس وقت سے لے کر اب تک انسانیت کے تخیل پر اس کا گہرا اثر باقی ہے۔

افلاطون کو خود اسی کی طرح ایک زبردست شاگرد ملا۔ یہ سکندر کا استاد ارسطو (۳۸۴ سے ۳۲۲ ق۔م) تھا۔ ارسطو نے بڑی محنت اور جفاکشی سے بے شمار حقائق اور تفصیلات جمع کیں اور ان کا امتحان و مقابلہ کیا۔ ان کے مطالعے سے ارسطو نے بعض ایسے اہم قوانین دریافت کیے جو فطرت اور انسانی زندگی دونوں پر عمل کرتے ہیں۔ غالباً ارسطو ہی پہلا سائنس داں تھا۔ اس کے طریقۂ تحقیق کو اسکندریہ کی عظیم الشان جامعہ کے محققوں اور طالب علموں نے اختیار کیا۔ ان لوگوں نے اپنی تحقیقات کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی کی، اور کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ سائنس کے لیے وسیع اور مضبوط بنیادیں رکھیں۔ اسکندریہ کے انھی عالموں میں ریاضیات کا سب سے بڑا ماہر اقلیدس تھا جس نے علمِ ہندسہ کو مدوّن کیا ہے۔ ایک دوسرے ریاضی داں ایراٹوس تیتھنز نے قطرِ ارض کی پیمائش کی، اور صرف پچاس میل کی کمی سے صحیح عدد تک پہنچ گیا تھا۔ اسکندریہ ہی میں ہیرآن نے پہلا دخانی انجن ایجاد کیا۔ ارشمیدس نے سائنس کی دنیا میں بہت سی تحقیقاتیں کیں۔ ان کی مدد سے بعد میں اس نے پیچ اور بیرم ایجاد کیے، اور دنیا کا سب سے پہلا میکانی انجن بن گیا۔ اسکندریہ نے طب میں بھی بہت سی ترقیاں کیں۔ مثلاً اہلِ اسکندریہ نے انسانی جسم کی حقیقی فطرت اور اس کی ساخت کا علم حاصل کرنے کے لیے سائنٹی فک طریقے پر عملِ جراحی کو رواج دیا۔ ان کی جامعہ کے عظیم الشان کتب خانے میں بے شمار کتابیں جمع کی گئی تھیں۔ لیکن یہ کتابیں اس وقت تک بڑی صبر آزما محنت کے ساتھ ہاتھ

ہی سے نقل ہوتی تھیں، اور ان میں غلطیوں کا بہت اندیشہ رہتا تھا۔
اس طرح ایتھنز اور اسکندریہ کے یونانیوں نے دنیا میں علم و حکمت کی روح پھونک دی۔ انھوں نے تجربوں، مشاہدوں اور جزئیات کے جمع کرنے میں انتہائی محنت اٹھائی تاکہ دُنیا اور دنیا کے اندر جو کچھ ہے اس کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور ہر واقعے کے اسباب و علل کا ٹھیک ٹھیک پتا چلا سکیں۔

یونان کا اثر دُنیا پر

اگرچہ یونانی اور بھی مختلف طریقوں سے دُنیا کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے مگر خاص طور پر انھوں نے فکر و فلسفہ اور فنونِ لطیفہ کی دُنیا پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ چند مشہور ترین مثالوں کو لیجیے۔ فنِ تعمیر میں اکروپولس پر پاتھینان کے عظیم الشان معبد مجسمہ سازی میں فی ڈیاکے مجسمے خصوصاً پاتھینان کے دیواری نقش جو اب تک برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ ڈراموں میں ایسی چائی لس، سفوکلس، یوری پی ڈس اور ارس طافنس کے ڈرامے، عشقیہ شاعری میں پنڈار کی شاعری۔ ان مثالوں پر غور کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونان نے مختلف فنون میں حسن و خوبی کے ایسے معیار بنائے ہیں جن کو دُنیا نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اور شاید اب تک بھی کوئی ان پر سبقت نہ لے جا سکا۔ یہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ یونان ہی نے ہم کو ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈس جیسے عالم دیے ہیں۔ اوّل الذکر تاریخ کا باوا آدام اور ثانی الذکر فلسفۂ تاریخ کا بانی ہے۔
کہا جاتا ہے کہ عصرِ حاضر کی ہر وہ چیز جو راہ ترقی پر گامزن ہے، دراصل یونانی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک چھوٹی سی قوم تھی اور اس کی عظمت بھی چند روزہ رہی، لیکن انسانیت اس کی کمال دانائی اور جدتِ طبع کا ہمیشہ ہمیشہ احترام کرتی رہے گی۔ اسی نے دُنیا کی جمہوریت، دستوری قانون، خود مختاری، آزادیٔ ضمیر کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اسی جدتِ طبع نے پہلی بار ہمیں یہ بتایا کہ انسان جس دُنیا میں بستا ہے، اس پر سائنس کے ذریعے وہ کس طرح کارفرمائی کر سکتا ہے۔

کس طرح عالمی ریاست وجود میں لائی جاسکتی ہے اور کس طرح ایسی ریاست میں تمام قومیں متحدہ رہ کر اپنی کامل آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

مشرق کی عظیم الشان قوموں نے انسانیت کے لیے تہذیب کے روحانی اساس، نفس پر فتح، اخوت، مساوات، خدمت اور خدائی بادشاہت کا انکشاف کیا۔ یونان کا عطیہ عملی ذرائع کا انکشاف ہے۔ یعنی حکومت کے طریقوں، اداروں اور استحقاق اور روبہ عمل لانے کے قابل حقوق کی دریافت ہے۔ انھی چیزوں سے کسی دن روحانی تصورات کی بنیاد پر ایک دائمی اور قابلِ عمل نظامِ تہذیب ساری دنیا میں قائم ہو سکے گا۔

پانچواں باب

رومہ

رومیوں کی اصل تقریباً اسی زمانے میں جب کہ ہلینی آریا یونان میں داخل ہوئے ہیں، ان کے رشتے دار آریا قبیلوں نے اطالیہ پر یورش کی۔ اطالیہ میں ان کو جنوبی تفقازی نسل کی شاخ اٹری کنس سے دوچار ہونا پڑا۔ اٹری کنوں کا تمدن منی آن تمدن سے کسی قدر ملتا جلتا تھا اور غالباً یہ لوگ ابتدا میں مشرق سے سمندر کے راستے اطالیہ پہنچے تھے۔ جس طرح ہلینیوں نے منی آنیوں کے ساتھ کیا تھا، ویسے اطالیہ کے آریا فاتحوں نے آتے ہی فوراً اٹری کنوں کو زیر نہیں کر لیا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ

اٹری کنوں نے ایک زمانۂ دراز تک آریاؤں پر حکومت کی ہوگی۔ آریا قبائلی جماعتوں میں سے ایک جماعت اطالیہ میں اٹری کنوں کے ملک کے جنوب اور جزیرہ نمی کے جنوبی حصے کی نوآبادیوں کے شمال میں آباد ہو گئی۔ یہ زراعت پیشہ اجڈ لوگ تھے اور ایک مقدس پہاڑی کے مرکزی معبد کے اطراف بارہ قصبوں میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ "لاطینی" کہلاتے تھے۔ ان کے ملک اور اٹری کنوں کے ملک کے درمیان ٹائبر کا دریا سرحد کا کام دیتا تھا۔ اس دریا کے ایک پایاب مقام سے قریب ڈھلواں پہاڑیاں واقع تھیں، جو زیادہ بلند تو نہ تھیں، لیکن مدافعت کے لیے موزوں تھیں۔ یہیں لاطینی نوآبادیوں کے ایک مجموعے نے نشوونما پایا، ان نوآبادیوں کو پہلے پہل تاجروں اور پناہ گزینوں نے آباد کیا تھا۔ بعد میں یہی نوآبادیاں مل کر شہر رومابن گئیں۔

رومی بادشاہ

ابتدائی زمانے میں روم پر بادشاہ حکمراں تھے، یا دوسری ابتدائی آریا قوموں کی طرح یہاں سرداروں کی حکومت تھی۔ روم کے بادشاہ کو امن اور جنگ دونوں زمانوں میں بڑا اقتدار حاصل تھا۔ رومیوں نے جنھیں قانونی تعریف میں بڑا ملکہ حاصل تھا، اس اقتدار کا نام "امپیریئم" رکھا تھا۔ بادشاہ سب سے بڑا مذہبی پیشوا اور صدر عدلیہ بھی ہوتا تھا۔ اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ امیروں کو طلب کر کے ان سے مشورہ کیا کرے گا۔ ان امیروں کی ایک جماعت تھی جو سینٹ کہلاتی تھی۔ اگر بادشاہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا اور خصوصاً موت وحیات کے معاملے میں جو اختیار اسے حاصل تھا، اسے شہریوں پر بے جا استعمال کرتا تو امیر طبقہ اس کی مزاحمت کرتا تھا۔ ان امیروں کے نیچے عوام تھے۔ ایک داستاں کی رو سے سروی ایس نامی ایک بڑے بادشاہ نے فوجی اور

مالی اغراض کے لیے ان عوام کی تنظیم کی تھی، اور شہر رومہ کو قلعہ بند کیا تھا۔ اس طرح منظم ہو جانے اور اپنی قوت کو محسوس کرنے کے بعد انھوں نے حکومت میں زیادہ حصے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس کا زیادہ قرینہ ہے کہ سرؔوی ایس کے مرنے کے بعد کسی اٹری کن نے رومہ کو فتح کر لیا، اور اٹری کن بادشاہ ظلم و زیادتی سے حکومت کرنے لگے۔

کونسلیں چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر میں اس غیر ملکی استبداد کے خلاف ابھر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک سخت کش مکش کے بعد اپنے شہر کی آزادی واپس لے لینے میں کام یاب ہو گئے۔ بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ مگر رومیوں نے اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے شاہی اقتدار اعلا یعنی "امپیریم" کو باقی رکھا اور اسے بادشاہ استعمال کیا کرتے تھے۔ آیندہ اس کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے "امپیریم" کی تقسیم کر دی گئی۔ بادشاہ کا فوجی اقتدار دو جحوں کو عطا کیا گیا جو "کونسل" کہلاتے تھے۔ مذہبی پیشوائی کے عہدے جو بادشاہ کا حصہ تھے ایک دوسرے عہدے دار کو دیے گئے یہ عہدے دار "قربانیوں کا بادشاہ" کہلاتا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ کے عدالتی اختیارات "پریٹروں" کو دیے گئے۔ ریاست کے ان تمام عہدوں میں سب سے زیادہ اہم کونسل کا عہدہ تھا، کونسل صرف ایک ہی سال تک عہدے پر رہتے تھے۔ ان کا تقرر پوری قوم کی اسمبلی کیا کرتی تھی اس طرح رومیوں نے جمہوریت کی طرف ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ یہ کونسل اپنی میقات کے ختم پر اسمبلی کے آگے ذمے دار ہوا کرتے تھے۔

ابتدا میں امیر بھی ہمیشہ کونسل ہوا کرتے تھے۔ کونسل اپنی خدمت اور اپنے محدود اختیارات کی وجہ سے امیروں کی مجلس یعنی سینٹ کے

مشورے پر کار بند رہنے پر ہمیشہ مجبور رہتے تھے۔ اس طرح روما کی حکومت میں سینٹ بہت جلد سب سے زیادہ با اختیار بن گئی۔

عوام اقتدار حاصل کرتے ہیں

پھر امیروں اور عوام میں نزاع کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ کش مکش اس لیے بھی تیز ہو گئی کہ درحقیقت ایتھنز کی طرح یہاں بھی بہت سارے عوام امیر قرض دہندوں کے بہت بری طرح مقروض ہو گئے تھے۔ متعدد مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ عوام کی جماعت نے اپنے واجبی حقوق کے کسی طرح بھی نہ ملنے سے بددل ہو کر روما کو خیر باد کہہ دیا۔ اور اس ارادے سے نکل کھڑی ہوئی کہ وہ خود اپنا ایک نیا شہر بسائیں گے۔ انھی ذریعوں سے سینٹ کو ہمیشہ مقتول کہا گیا۔ چناں چہ قرضے منسوخ کر دیے گئے، نئے قانون بنائے گئے یہاں تک کہ عوام نے رفتہ رفتہ بغیر کسی خوں ریزی کے حکومتی اقتدار پر پورا پورا قبضہ کر لیا۔

پانچویں صدی کی ابتدا میں عوام نے "ٹریبیون" کے تقرر کی اجازت حاصل کر لی۔ ان عہدے داروں کا انتخاب وہ خود اپنے ہی لوگوں میں سے کیا کرتے تھے۔ ان کا فرضِ منصبی یہ تھا کہ امیروں کے ظلم سے انھیں محفوظ رکھیں۔ آخر کار ان عہدے داروں کو اتنے وسیع اختیارات دیے گئے کہ کسی قانون یا کسی مجسٹریٹ کی تجویز، جس سے عوام کی سلامتی کو خطرہ ہو، اس کے خلاف یہ اپنا امتناعی حکم جاری کر سکتے تھے۔ کچھ عرصے بعد عوام نے اس قسم کے قوانین کی تدوین و اشاعت کا مطالبہ کیا اور اپنے مطالبے کو آخر کار منوا بھی لیا، جن کی رو سے قانون کے آگے ہر شہری مساوی تھا۔ امرا اور عوام کے درمیان شادی بیاہ کا حق دیا گیا۔ اس سے روما میں ذات پات کی تفریق کا

خطرہ جاتا رہا) اسمبلی کو مقتدرِ اعلا تسلیم کر لیا گیا اور آخر کار رلی سی نین قوانین ۳۶۷ ق م کی رو سے) عاملہ کو اس طرح قابو میں رکھا گیا کہ دو کونسلوں میں سے ایک لازماً اور ممکن ہو تو دونوں کونسل عوام میں سے ہو سکیں گے۔ ان لی سی نین قوانین نے قرضہ اور ایک دولت مند طبقے کے پاس بہت زیادہ رُپے جمع ہو جانے کے خلاف خاص احتیاطی تدبیریں اختیار کیں۔

اس امرا اور عوام کی باہمی کش مکش کا نتیجہ آزاد شخص کی ذات اور جایداد کی حفاظت کا عظیم الشان اصول قائم کرنا تھا، خواہ ایسا آزاد شخص کسی طبقے کا ہو۔ یہ اصول انسان انسان کے درمیان عدالتی انتظام پر قابو رکھنے والے قطعی قوانین کی صورت میں مجسّم کر دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے رؤمیوں کے تصورِ قانون کو یونانیوں کے اس دستورِ قائمہ کے تصور سے ممیز کرنا چاہیے کہ ریاستی اختیارات شہریوں کی خاص جماعتوں کے تفویض کیے گئے ہیں۔ اسی قانون کے لیے دُنیا یونان کی رہینِ منت ہے۔ اس لحاظ سے رؤمہ نے انسانیت کی زندگی کی کوئی خدمت بھی کی ہے تو وہ یونان کے مقابلے میں بہت کم پایہ ہے، کیوں کہ ریاست اور اس کے شہری افراد کے درمیان حقیقی آزادی کے حصول کے لیے تعلقات کا انتہائی قابلِ تعریف انضباط اس وقت تک بے کار ہے جب تک خود شہری افراد کے درمیان باقاعدہ اور پُرامن تعلقات قائم رکھنے اور ان تمام بے شمار لڑائی جھگڑوں سے بچانے کے لیے معقول انتظام نہ کیا گیا ہو، جو ایک گنجان آبادی کی زندگی میں روزمرّہ پیش آتے ہیں۔ دورِ حاضرہ کے وسیع تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ صرف عمومی دستور ہی کافی نہیں ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان دستوروں کو مضبوط اور قابلِ احترام فوج داری اور دیوانی قوانین سے تقویت دی جائے۔ ایسے قوانین کو غارت گر جماعتوں یا مجلسوں یا افراد کے حملوں

سے شہری کی آزادی کو بچانے کے لیے مدوّن کیا جانا چاہیے۔

لڑائیاں

اس دوران میں رومہ کی فوجی قوت بہ تدریج ترقی کرتی جا رہی تھی رومہ کی رعایا ابھی تک جفاکش، محنتی اور آزاد کاشت کار آبادی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ لوگ اپنے شہر کی خدمت کے لیے سخت ترین فوجی نظم و ضبط کے لیے بھی مستعد تھے۔ انھوں نے گال قوم کے حملوں کے دوران میں سخت مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ ان حملوں میں خود رومہ کو لوٹ لیا گیا تھا (سنہ ۳۹۰ ق م) انھوں نے ایٹری کن اور دوسری ہمسایہ قوموں پر فتح پائی اور تیسری صدی قبل مسیح کی ابتدا میں رومہ وسطی اطالیہ کا بے حجت مالک بن بیٹھا۔ اس کے بعد یونان میں سکندر کے ایک جانشین فیرّس کے ساتھ ایک بڑی جنگ ہوئی، اس جنگ کے نتیجے کے طور پر رومی اقتدار جنوبی اطالیہ پر بھی چھا گیا (سنہ ۲۸۱ سے سنہ ۲۷۵ ق م)

اس کے بعد (سنہ ۲۶۴ ق م) رومہ دولت مند فنیقی تجارتی شہر قرطاجنہ کے ساتھ ایک طویل اور خوف ناک جنگ میں مبتلا ہو گیا۔ قرطاجنہ کا ذکر اس سے پہلے بھی اس حیثیت سے آچکا ہے کہ یہ شہر اپنے مرکز سے ایک عظیم الشان تجارتی سلطنت کی تعمیر کر رہا تھا۔ یہ مرکز بحرِ روم کے جنوبی ساحل پر واقع تھا اور اس کی عظیم الشان سلطنت کی بیرونی چوکیاں انگلستان تک پہنچ گئی تھیں۔ قرطاجنہ نے ہنی بال جیسا سپہ سالار پیدا کیا جو تاریخِ عالم کے عظیم ترین سپہ سالاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہنی بال ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ کوہ آلپس کے راستے اسپین سے روانہ ہو کر اطالیہ میں داخل ہو گیا، اور پندرہ سال تک تقریباً بغیر کسی کمک کے یکے بعد دیگرے ان فوجوں کو برباد کرتا رہا جو رومہ سے اس کے مقابلے کے لیے روانہ کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ رومی علاقے میں جو جی چاہا،

کرتا گیا۔ صرف تازہ کمک نہ ملنے اور ایک بڑے میں محاصرے کو جاری رکھنے کے لیے ضروری آلات کی کمی نے ہنی بال کو خود روما کی فتح اور بربادی سے باز رکھا۔

آخر کار ۱۴۶ ق۔م قرطاجنہ کے ساتھ اس ہولناک کش مکش میں روما کو ہمیشہ کے لیے فتح حاصل ہوئی۔ اس ہولناک کش مکش پر اس وقت تک ایک سو بیس سال گزر چکے تھے۔ اس سال قرطاجنہ بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ اسی دوران میں روما، اسپین سے لے کر یونان کی بحیرۂ روم کی دنیا کا مالک بن گیا۔ قرطاجنہ جیسے زبردست حریف کی تباہی کے چند سال بعد ایشیائے کوچک کے ایک بڑے حصے کو بھی اب اس ملک میں داخل کر لیا گیا جو رومن امپائر یا سلطنتِ روما بن گیا تھا۔

سینٹ کی حکومت

لیکن مسلسل لڑائیوں نے رومی سلطنت کی ہیئت کو بالکل بدل دیا تھا۔ ہنی بال نے اطالیہ پر تاخت کے دوران میں قدیم محنتی کاشت کار طبقے کو تباہ کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھیتیوں کی جگہ اب وہاں بڑی بڑی زمین داریاں تھیں۔ ان کے مالک دولت مند سرمایہ دار تھے اور ان میں غلاموں کی ٹولیاں کام کرتی تھیں۔ جو لوگ پہلے کاشت کار تھے، اب پیشہ ور سپاہی بن گئے یا روما میں آ بسے تھے۔ یہاں انھوں نے بے کاروں کا اپنا انبوہ بنا رکھا تھا۔ بے کاروں کا یہ انبوہ ہمیشہ شر و فساد پر آمادہ رہتا تھا۔ ایتھنز کی طرح اسے ریاست کی طرف سے سستے داموں کھانا ملا کرتا تھا۔ یہ اسمبلی پر اپنا ناواجبی اثر ڈالا کرتے تھے کیوں کہ ایتھنز کی طرح روما میں راست جمہوریت کا مفہوم یہ تھا کہ اسمبلی میں ہر شہری ایک ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے۔ مگر یہ حق شہر میں رہنے والے ان ہی لوگوں کے کام آتا تھا جو اس کے

استعمال کرنے کی فرصت رکھتے تھے ۔ اس دوران میں اگرچہ رومی شہریت کو رفتہ رفتہ اطالیہ کے دوسرے باشندوں تک وسعت دے دی گئی تھی، تاہم عملاً اس عظیم الشان سلطنت پر ایک شہری ریاست کے ذریعے حکومت کی جاتی تھی۔ یہ شہری ریاست اپنے اصلی خط و خال میں ان شہری ریاستوں کے مماثل تھی جن کی کامیابی اور ناکامی کا ہم یونان کے سلسلے میں مطالعہ کر چکے ہیں۔ رومی حکومت کو مسلسل نہایت اہم فیصلے کرنے پڑتے تھے ۔ ان فیصلوں کا اثر لاکھوں افراد پر پڑتا تھا۔ ان کے لیے صحیح معلومات یا کامل راز داری کی ضرورت تھی ۔ رومی حکومت کو دور دراز مقامات کی پیچیدہ فوجی مہموں کی رہنمائی اور فکر کرنی پڑتی تھی ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روما میں ایک نئی طرز حکومت کو عروج حاصل ہوا جو "عدیدیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ عدیدیہ سے عام طور پر چند تجربے کار اور دولت مند لوگوں کی حکومت مراد ہے[1]۔ سینٹ کو غیر معمولی اقتدار حاصل ہو گیا۔ اس میں وہ تمام لوگ شریک تھے جو ریاست کے اعلا عہدوں پر فائز رہ چکے تھے ۔ ان کے علاوہ دوسرے ایسے لوگ بھی تھے جن کو پہلے "کونسلوں" نے اور بعد میں سنسروں نے نامزد کیا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں۔ ریاست کے عہدے دار امرا کی طرح عوام بھی ہو سکتے تھے، اور ان سب کا انتخاب عام اسمبلی کیا کرتی تھی ۔ رومی ذہنیت کی انتہائی قدامت پسندی اور تجربے کار قیادت کی ضرورت نے قاعدے کے طور پر عہدے داروں کے انتخاب کو بڑے

---

[1] "عدیدیہ" کی اصطلاح ایسی حکومت کے لیے استعمال ہو چکی ہے جیسی کہ یونانی شہری ریاستوں میں تھی۔ لیکن یونان کی عدیدیہ ایک قسم کی خود غرضانہ جماعتی حکومت تھی لہٰذا اسے روما کے بہترین زمانے کی عدیدیہ سے بالکل مختلف سمجھنا چاہیے ۔

خاندانوں کے تنگ دائرے میں محدود کردیا۔ ان خاندانوں کو حکومت اور اقتدار کی روایتوں نے خاص امتیازات اور مرتبہ دے رکھا تھا۔ اس کے باوجود ایک نئی اشرافیہ پیدا ہوگئی۔ یہ اشرافیہ عہدوں کی اشرافیہ تھی۔ اس کے اقتدار کے دعوے کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ وہ قدیم امیروں کی نسل سے تھی کیوں کہ اس کے دائرے میں امرا اور عوام دونوں شامل تھے۔ اس کی بنیاد ان خدمتوں پر تھی جو اس نے گزشتہ دنوں میں سلطنت کے لیے انجام دی تھیں۔

اس کے علاوہ کونسلوں کی عہدہ داری کی مختصر سی میقات اور یہ امر کہ جو کچھ بھی کریں گے، بعد میں اس کے ذمے دار ہوں گے، انھیں قدرتاً سنیٹ یعنی "بادشاہوں کی اسمبلی" کا مطیع کردیا تھا۔ عام اسمبلی بھی مسلسل فتوحات حاصل کرنے میں ایسی ہی جماعت کی ہدایت سے رہ نمائی قبول کرنے پر آمادہ و راضی تھی۔ کیوں کہ جنگوں کے لیے بھرتی انھی کی رائے کے تابع تھی اور فتوحات سے حاصل شدہ مالِ غنیمت میں یہ اسمبلی حصے دار ہوتی تھی۔ اس طرح رفتہ رفتہ روما کی سنیٹ بحیرۂ روم کی دنیا پر مطلق العنان حکم راں بن گئی۔

سنیٹ کا زوال

لیکن اب رومی کردار پر سلطنت کی حرص و ہوا نے قبضہ کرلیا۔ اقتدار اور مالِ غنیمت نے بہت سے سنیٹروں کو بے انتہا مال دار بنا دیا تھا۔ دولت اور وہ چیزیں، جنھیں دولت خرید سکتی ہے، لوگوں کی ذہنیتوں پر بڑھتی ہوئی کشش اور اثر سے کام لینے لگیں[۱]۔ قدیم زمانے میں رومی خاندان میں نظم و ضبط پر بہت زور دیا جاتا تھا کیوں کہ

---

[۱] روما کے اوّلین سکے، جن کا ہمیں علم ہے، ۲۶۹ ق۔م کے قریب لیڈیا میں ڈھالے گئے۔ اس زمانے سے "بارٹر" کے طریقے کی بجائے سکّے کا استعمال تیزی سے بڑھنے لگا۔

رومی جانتے تھے کہ کوئی قوم حکومت نہیں کرسکتی تاوقتیکہ خود اسے اطاعت کرنی نہ آئے۔ مگر آگے چل کر بچوں کی تعلیم وتربیت کا کام زیادہ تر غلاموں پہ چھوڑ دیا گیا۔ یہ غلام عموماً بداخلاق اور آوارہ ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ رومی تعلیم ایک انحطاط یافتہ یونانی تعلیم بن گئی۔ خصوصاً فن خطابت میں یہ بات بالکل صادق آتی تھی۔ فنِ خطابت عوام کو بہکانے اور سیاہ کو سفید ثابت کرنے کا فن تھا اور اسے راست جمہوریت کے ذریعے حکومت کی جانے والی قدیم شہری ریاست میں انتہائی اہمیت حاصل تھی۔

شہری انبوہ نے مفت کھانے اور غیر محدود شمشیر زنی کے تماشوں کے لیے روز افزوں شور مچانا شروع کر دیا۔ ان تماشوں میں درندوں اور انسانوں کی خوں ریزی صرف اس لیے کی جاتی تھی کہ خون کی پیاسی شہری آبادی کو محفوظ کیا جائے۔ سنیٹ کے اراکین جو باہر صوبوں کے گورنر بنا کر بھیجے جاتے تھے، ان کو اپنی میقاتِ ملازمت میں کامل "امپیریم" حاصل رہتا تھا۔ اس امپیریم کو وہ اپنی رعایا کو لوٹنے، جبراً رشوت حاصل کرنے اور ہزاروں طریقوں سے ظلم ڈھانے میں استعمال کیا کرتے تھے۔

اس اثنا میں جنگوں، عوام کی شورشوں اور بڑھتی ہوئی عیش پسندی اور بدکاری کے باوجود بہر صورت رومیوں کی دانائی نے انسان انسان کے درمیان باہمی تعلقات کی توضیح کے کام کو استقلال کے ساتھ جاری رکھا۔ چناں چہ اس کی وجہ سے ایک عظیم مجموعۂ قانون مدوّن ہو گیا۔ یہ مجموعہ نہ صرف شہریوں کے کام آتا تھا بلکہ رومیوں اور غیر ملکیوں کے باہمی معاملات میں بھی کارآمد تھا۔

جیسے جیسے قدیم رومی عادات واطوار میں انحطاط آنے لگا، اقتدار کی ہوس

بھی زیادہ خطرناک ہوتی گئی۔ سنیٹ کی روایتی عزت اور دیانت داری کافور ہونے لگی۔ امیر و غریب میں پھر ایک بار سخت کش مکش شروع ہوگئی کیوں کہ "اطالیہ کے طول و عرض میں بڑی بڑی زمین داریوں کے قیام کے یہ معنی تھے کہ روما میں ایسے بے زمین، غیر مطمئن اور مقروض لوگوں کے انبوہ کو جمع کیا جائے جو کسی زمانے میں چھوٹے چھوٹے کسان اور آزاد مزدور تھے۔ اس طرح جتھے بندی کے تلخ احساسات پیدا ہوئے اور وحشیانہ شر و فساد کا بازار گرم ہوگیا۔

یونانی شہری ریاست کے انحطاط کے اسباب میں سب سے بڑا سبب نفاق تھا اور سب سے بڑے یونانی مورخ نے کہا تھا:

"ان تمام خرابیوں کا سبب اقتدار کی خواہش تھی جو حرص و طمع سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش جتھے بندی کی وہ روح تھی جو انسانوں میں اس وقت پیدا ہو جاتی ہے، جب کبھی وہ علانیہ فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ دونوں طرف سے قائد دل خوش کن وعدے کرتے ہیں، اس لیے ایک پارٹی بہتوں کے لیے دستوری مساوات کا اعتراف کرتی ہے، اور دوسری پارٹی اشرافیہ کی دانائی کا اقرار کرتی ہے۔ بہرحال ان لوگوں نے مفادِ عامہ کو جس کے وہ برائے نام حامی تھے، اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا۔ ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی جان توڑ کوشش میں انھوں نے خوف ناک جرائم کا ارتکاب کیا۔۔۔۔۔۔ اور شہری، جو کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، دونوں کا شکار ہوئے۔"[1]

یہ نقشہ نہایت خوبی سے اس افتراقی جذبے پر چسپاں ہوتا ہے جس نے

---

[1] "تھی سی ڈی ڈس" صفحہ ۲۲۳ ترجمہ از جوویٹ۔

رومی جمہوریت کے آخری سو سالوں میں مسلسل خوں ریز خانہ جنگیوں، ظلم، انقلاب اور قتلِ عام کے ذریعے سلطنت کی چولیں ہلا دی۔

ایک طرف جتھے بندی کا عام جذبہ تھا جو عام طور پر تشدد کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرتا تھا کیوں کہ انقلاب سے انھیں ریاست کی دولت، اقتدار اور مالِ غنیمت میں ایک بڑا حصہ مل جاتا تھا۔ دوسری طرف سنیٹ کی پارٹی تھی، یہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اس سونے کی چڑیا کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی تھی، جو بحیرۂ روم کی دنیا پر تسلط رکھنے سے اس کے ہاتھ آئی تھی۔

اس کے علاوہ خود روما کے باہر اطالیہ کا وہ حصۂ ملک جسے ابھی ووٹ دینے کا حق نہیں ملا تھا، رومی شہریت، اور رومی شہریت کے تمام منافع یعنی ستا غلہ اور دنیا کی لوٹ میں حصہ حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

اس دوران میں روما کی عظیم اور فتح مند فوج خود غرضی اور نفاق کے تلاطم میں بھی بڑی حد تک ہمیشہ ایک زبردست قوت بنی رہی۔ دوسری صدی قبل مسیح کے اختتام تک یہ فوج ایک مستقل پیشہ ور فوج بن گئی تھی، جس میں خانہ بدوش، ظلم و زیادتی میں تربیت یافتہ اور حکومت سے زیادہ اپنے فوجی افسروں کی تابع داری کرنے والے لوگ شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت جماعت بندیوں سے پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ایک سیدھے سادے سپاہی کے لیے یہ تحقیق کرنا ممکن نہ تھا کہ حکومت کیا چیز ہے جس کا اسے وفادار رہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے حریص اور طامع سپہ سالاروں کی بن آئی جو وطن یا وطن سے باہر لڑائیوں میں کامیاب رہے تھے۔ ان لوگوں نے روما میں اپنے ذاتی اثر و مرتبہ اور اپنی منظم و تربیت یافتہ فوج کو علانیہ طور پر کسی ایک برسرِ پیکار

جماعت کی حمایت میں استعمال کرنا شروع کر دیا، مگر دراصل ان کوششوں سے ان کا مقصد خود اپنے لیے اقتدارِ اعلا حاصل کرنا ہوتا تھا۔

شہنشاہی حکومت کی ابتدا

ان فوجی لیڈروں میں پہلا لیڈر ماریس تھا۔ اس نے شمالی افریقہ کے ایک حصے کو فتح کرنے اور جرمن حملہ آوروں کے ایک خطرناک حملے (سنہ ۱۰۲ ق م) کو پسپا کرنے کے بعد روم کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ اس پس و پیش کی وجہ سے کہ کس جماعت کا ساتھ دے، اپنے مقصد میں ناکام رہ گیا۔

اس کے بعد سلا، ایشیائے کوچک میں ایک زبردست بغاوت اور اطالیہ میں دوسری بغاوت فرو کرنے کے بعد نہایت سُرخ رُو ہو کر روم واپس آیا۔ اس نے سنیٹ کی جماعت کا ساتھ دیا اور عام جماعت کے پانچ ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا (سنہ ۸۲ ق م)

اس کے بعد پامپی نے تین مہینے ایک شان دار مہم جاری رکھ کر بحرِ روم کو بحری ڈاکوؤں سے پاک کیا، اور شام فتح کرنے کے بعد روم کی کش مکشِ اقتدار میں اور آگ بھڑکانے کے لیے واپس ہوا (سنہ ۶۱ ق م) یہاں آ کر اس نے جولیس سیزر سے شکست کھائی اور نکال دیا گیا۔ جولیس سیزر اپنے پیش روؤں سے بہت زیادہ بڑا آدمی تھا۔ اس نے فرانس اور برطانیہ سے نو سال خوف ناک جنگ میں ایک بہترین فوج کی تربیت کی تھی، اور اب عام جماعت کے ایک زبردست حامی کی حیثیت سے روم واپس ہوا تھا۔ اپنے تمام منصوبوں اور مقصدوں کے حصول میں جولیس سیزر پوری رومی دنیا کا مطلق العنان آمر بن گیا۔ حتیٰ کہ اس کا مجسمہ روم کے مندر میں بھی نصب کیا گیا تھا۔ اس پر

کندہ تھا: "ناقابلِ تسخیر خدا کے لیے"۔ لیکن اس سے پہلے کہ اسے اپنے کام کے آغاز سے کچھ آگے بڑھنے کا موقع ملتا، سینٹ کی پارٹی اس کے قتل میں کامیاب ہوگئی (۴۴ ق م)۔ جو کام وہ کرنا چاہتا تھا، یہ تھا کہ دنیا کو ایک ایسی بڑی مشین کی صورت میں ڈھال دے جسے ایک آدمی کا ہاتھ چلا سکے۔

جولیس سیزر کے مرتے ہی تازہ خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آخرکار آکٹے ویئن، یا آگسٹس نے جیسا کہ بعد میں اس نے اپنا لقب اختیار کرلیا تھا، پوری طرح فتح مند ہوکر قابلِ تعریف فرزانگی، نرمی اور عملی قابلیت کے ساتھ جولیس سیزر کے کام کو مکمل کرنا شروع کیا (۳۱ ق م)۔ جہاں تک ممکن تھا سینٹ کے اقتدار اور مرتبے کا تحفظ کیا گیا۔ مگر آگسٹس نے فوج اور حکومت کے تمام اہم شعبوں کو اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ "امپائر" یا سلطنت کا لفظ اسی کے وقت سے وجود میں آیا کیوں کہ آگسٹس اور اس کے جانشینوں نے پوری رومی دنیا کے طول و عرض میں "امپیریم" یعنی اقتدارِ اعلا کو استعمال کیا تھا۔ اس نے "عوام کے عدالتی حاکمِ اعلا" کا منصب بھی خود ہی اختیار کرلیا۔ اس طرح آگسٹس نے قدیم شاہی اور اشرافی اقتدار کو عوام کے منتخب مجسٹریٹ کے اقتدار کے ساتھ متحد کردیا۔

آگسٹس نے دوبارہ نظم قائم کرنے کے کام کو اتنی دانائی اور دقتِ نظر کے ساتھ انجام دیا کہ اس کی وفات کے بعد سلطنت کو اور چار سو سال تک بقا نصیب ہوئی۔ اگرچہ پہلی صدی عیسوی میں اکثر شہنشاہ بدچلن گزرے ہیں، پھر بھی وہ حکومت کے اچھی طرح قابل تھے۔ اس دوران میں شہنشاہ اور اس کی فوج کے مقابلے میں سینیٹ کا اقتدار بتدریج گھٹتا گیا۔ دنیوی اقتدار اور عیاشی کی وجہ سے رومی کردار بھی تیزی کے ساتھ بگڑنے لگا۔

دوسری صدی عیسوی انٹونیوں کا عہد تھا۔ اس عہد میں جفاکش، سمجھ دار اور قابل شہنشاہ یکے بعد دیگرے جانشین ہوتے رہے۔ ان کے زمانے میں داخلی طور پر امن و امان تھا اور بڑی حد تک آسودگی و شادمانی حاصل رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطنت کی حدیں بھی اسکاٹ لینڈ سے خلیج فارس تک وسیع ہو گئی تھیں۔

اس کے بعد کی دو صدیوں کا زمانہ، زوال و انحطاط کا زمانہ ہے۔ ان صدیوں کے دوران میں آریا قبیلوں کے مسلسل حملوں سے سرحدیں پارہ پارہ ہو کر اندر کی طرف ہٹ آئیں۔ یہ آریا قبیلے وہ تھے جو منگولی قبیلوں کی مغربی جانب پیش قدمی کے دباؤ سے آگے کی طرف دھکیل دیے گئے تھے۔

فوجی استبداد

اگرچہ رومی سلطنت اتنی طویل مدت تک باقی رہی لیکن درحقیقت وہ ظلم و زیادتی کا ایک وسیع نظام بن گئی تھی۔ شہنشاہ کا مرکزی اقتدار صرف قوت اور تنہا فوجی حمایت پر قائم تھا جب ایک طاقت ور شہنشاہ مر جاتا، یا کوئی کم زور شہنشاہ تخت پر آتا تو چوں کہ جانشینی کا کوئی قاعدہ ہی نہیں تھا، اس لیے عام طور پر خانہ جنگی کا دور شروع ہو جاتا اور اس وقت تک باقی رہتا تھا جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک کام یاب ہو کر اپنے حریفوں کو نکال نہ دیتا۔ ایک موقع پر ایسا بھی ہوا کہ فوجوں نے شہنشاہ کے رتبے کو نیلام پر چڑھا دیا اور سب سے بڑی بولی دینے والے کے نام ختم کر دیا۔ اس کے لیے جو قیمت ادا کی گئی تھی، اسے فوجوں نے آپس میں بانٹ لیا۔

سلطنت کی سیرت کا اندازہ کچھ اس سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے کہ سلطنت کے حکمراں ظالم اور ان کے دامن خوں ریزیوں سے داغ دار ہونے

سے باوجود اپنی سلطنت کے پورے طول و عرض میں دیوتا کی طرح پوجے جاتے تھے۔ عیسائیوں کی طرح وہ لوگ جو اس پرستش میں شامل نہیں ہوتے تھے، قتل کردیے جاتے تھے۔ شہنشاہ کی پرستش حقیقت میں سرکاری مذہب بن گیا تھا، اور اس میں شرکت سے انکار ریاست کے خلاف جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح ضمیر کی آزادی کو وحشیانہ طور پر کچل دیا گیا تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا مرکزی حکومت کا دباؤ اتنا سخت اور شدید ہوتا گیا کہ اس نے ہر قسم کی آزادی پر اپنی مہر لگادی۔ سماج کی بنیاد غلامی پر رکھی گئی۔ یہ استبداد بغیر کسی رکاوٹ کے بڑھتا ہی رہا، یہاں تک کہ آزاد کاشتکار قرضوں میں بری طرح دب کر دولت مند زمین داروں کے غلام یا کم سے کم ان کے زرعی غلام بن گئے۔ ان زرعی غلاموں پر لازم تھا کہ وہ ان کی زمین داریوں میں بے اجرت کام کیا کریں۔ کسی اور جگہ ترک وطن کر جانے کی انھیں ممانعت تھی۔ ان خدمتوں کے صلے میں انھیں زمین کا صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں خود ہی اس پر کھیتی باڑی کریں۔ دوسری طرف ان دولت مند لوگوں کو شہنشاہ کے راشی عہدے دار دل کھول کر لوٹتے تھے۔

سلطنت کی پہلی دو صدیوں میں بلدیوں کے اندر یقیناً بہت بڑی حد تک آزادی اور آسودگی حاصل تھی۔ یہ بلدیے صوبوں میں کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو حکومت خود اختیاری کے بعض اختیار دیے گئے تھے، اور اس کے مالدار طبقے تمدن کے ایک کافی اعلا معیار کو برقرار رکھنے کے قابل تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ مرکزی حکومت کی تباہ کن سفاکی نے ان بلدیوں کی آزادی اور خوش حالی کو بھی کچل ڈالا۔ دوسری صدی عیسوی کے ختم

پر مال دار لوگوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بلدیہ کے کونسلر بنے رہیں جو لوگ اس خدمت پر مامور ہوتے تھے ان پر سخت تکلیف دہ بوجھ لاد دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد تو کسی کو بلدیے کے کونسلروں میں شامل کرنا گویا سزا کے مترادف ہو گیا تھا۔ حکومت جن لوگوں سے ناخوش ہوتی، ان کو سزا دینے یا عتاب نازل کرنے کے لیے اسے سزا کا ایک نظر فریب طریقہ بنا لیا گیا۔ رفتہ رفتہ بہت زیادہ مال دار زمین داروں اور مفلس ترین غریبوں اور زرعی غلاموں کے علاوہ سماج کے اوسط طبقے ناپید ہو گئے۔

اس دوران میں بڑے بڑے شہروں کے اندر مزدوروں کی تنظیم کا آغاز ہو رہا تھا۔ یہ تنظیم اس قدر سخت تھی کہ ذات بندی کے قریب قریب پہنچ گئی تھی سینیٹ کی رکنیت سے لے کر نان بائی تک اکثر پیشے کم و بیش موروثی ہو گئے تھے "تیسری صدی کے اختتام پر تمام اہل حرفہ اور کاریگر حکومت کے زیر اثر تجارتی اداروں میں شرکت پر مجبور کر دیے گئے۔ قانوناً ان لوگوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ ان اداروں سے کبھی علیحدہ نہ ہوں، کیوں کہ رومی ذات پات کے ضابطوں کو ریاست کے قانون کے ذریعے نافذ کیا گیا تھا" چوتھی صدی میں ہر رکن ادارہ، اس کے تمام بیٹے اور اس کی جائداد (خواہ کسی ذریعے سے حاصل کی گئی ہو) تجارتی ادارے کی ناقابل انتقال ملکیت سمجھی جاتی تھی .... اگر کوئی شخص کسی رکن ادارے کی بیٹی سے شادی کر لے تو اس پر لازم تھا کہ وہ اپنے خسر کے کام میں شریک ہو جائے (بعد میں اپنے ادارے سے باہر شادی کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی) اس طرح سلطنت ایک بڑا قید خانہ بن گئی جہاں تمام آدمی اپنے مذاق کے مطابق نہیں بلکہ جبراً کام کیا کرتے تھے"[۱] "بعد کی

---

[۱] جانس ان ماڈرن لائف، مصنفہ فلنڈرس پائٹری منقول، از سلطنتوں کا انجام ص۱۲۹ مصنفہ ہیو بارٹ۔

رومی سلطنت میں لوگوں کو باپ دادا کے پیشے اختیار کرنے پر مجبور کر کے اور مختلف طبعی میلانات اور مدارجِ زندگی میں ان پیشوں کی آزادانہ گردش کو روک کر سماج کو غیر متحرک اور لکیر کا فقیر بنا دینے کا میلان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شخص جو اسٹیبل کے عام ذخیروں کے لیے افریقہ سے اناج لاتا، نان بائی، جو تقسیم کے لیے روٹیاں تیار کرتا، قصاب، شراب ساز اور عام حماموں کو گرم رکھنے والے یہ سب کے سب نسلاً بعد نسلٍ یہی خدمتیں انجام دینے پر مجبور تھے۔ وہی زرعی غلامی کا اصول سماجی زندگی کے کاموں میں استعمال کیا گیا۔ راہ فرار ہر طرف بند تھی۔ ایک شخص نہ صرف اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور تھا، بلکہ اسے اپنی ماں کے لحاظ سے بھی مجبور ہونا پڑتا تھا۔ لوگوں کو اپنی جماعت کے باہر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔[1]

نسلی خودکشی

رومی عیش و نشاط کا سامان اور عجیب و غریب جانوروں کو مہیا کرنے کے لیے ساری دُنیا چھان ڈالی گئی۔ بڑے بڑے عام تماشوں میں ایسے جانوروں کی خوب مانگ تھی۔ شمشیر زنی کی بے رحمانہ نمائشوں کے لیے قربانیوں کی کثیر تعداد درکار تھی اور ایسی نمائشیں بہت مقبول اور عام ہو گئی تھیں۔ ان کھیل تماشوں کے لیے سالانہ جو تعطیلیں دی جاتی تھیں، ان کی تعداد آگسٹس کے عہد میں ۶۶ سے ترقی کر کے ۱۷۵ یا چوتھی صدی میں اس سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ سستی غذا کی رسد کے لیے جو رقمیں علیحدہ کی جاتی تھیں، ان میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ غرض اس طرح رومی قوم کے اخلاقی تنزل کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔

اخلاقی تنزل کی سب سے زیادہ خطرناک علامت یہ تھی کہ شادی

---

[1] مغربی سلطنت کی آخری صدی میں رومی سماج صفحہ ۱۹۴ مصنفہ ڈِل۔

ایک بے حقیقت تمسخر بنتی جا رہی تھی۔ معمولی سی معمولی بات پر طلاق دی جانے لگی۔ لوگوں کی بڑی اکثریت غالباً کبھی شادی کرتی ہی نہ تھی۔ نوزائیدہ بچّوں کو مار ڈالنا یا انھیں پھینک دینا بہت عام تھا۔ اس زمانے کا ایک مصنف پلوٹس کہتا تھا: "کوئی شخص صاحبِ اولاد ہونے کا اقرار نہیں کرتا تھا کیوں کہ جس شخص کے وارث ہوں، اسے کسی تہوار کے اجتماع میں کبھی دعوت نہیں دی جاتی، بلکہ اسے سماج کے ادنا ترین طبقوں میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس بے اولاد لوگوں پر اعزاز کی بارش کی جاتی ہی اور وہ تمام فضائل کا مجموعہ بن جاتا ہی"۔ اولاد نہ ہونے کے فائدے اتنے کثیر تھے کہ سنیکا (ایک زبردست فلسفی اور مدبّر) ایک ماں کو جس کا اکلوتا بیٹا حال ہی میں مر گیا تھا، یہ یاد دلا کر اسے تسلّی دیتا ہی کہ اب اس کی اس سے بھی زیادہ قدر و منزلت ہو گئی (یعنی ان لوگوں کی طرف سے جو اس کے وارث بننے کی تمنّا رکھتے تھے) جو شخص شادی کر لیتا اس کی عقل اور حواس پر شبہ کیا جاتا تا[1]

اس مہلک نسلی خودکشی کے عمل کو روکنے کی قانونی ذرائع سے انتہائی جدّ و جہد کی گئی۔ صاحبِ اولاد لوگوں کے محصول معاف کر دیے گئے۔ تمام ملازمتوں میں ترقی دینے کے لیے خاص طور پر ان ہی لوگوں منتخب کیا گیا۔ ترکہ پانے کے لیے انھیں خاص حقوق دیے گئے۔ شادیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے عام طور پر سختی سے قانون نافذ کیے گئے۔ لیکن یہ سب اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ سب سے بڑا رومی مورّخ ٹیاسی ٹس کہتا ہی کہ پہلی صدی عیسوی میں شادی بیاہ اور پرورشِ اولاد بالکلیہ فیشن کے خلاف سمجھی جاتی تھی۔ "اپنے بعد وارث

---

[1] " ان جج کی کتاب " سینزروں کے عہد میں رومی سماج " صفحہ ۱۳۱ ملاحظہ ہو۔
" سلطنتوں کا انجام " صفحہ ۱۸۱ مصنفہ ہیوبارڈ۔

ہونے کے لیے بچے نہ رکھنے کا فائدہ نافرمانی کی سزا سے زیادہ سمجھا جاتا تھا۔"
ان حالات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ رومی نسل بہت بڑی حد تک ناپید ہوگئی۔ ان کی جگہ ان غلاموں کی نسل چلی جنھوں نے قیمت دے کر آزادی حاصل کی تھی یا سلطنت کے دوسرے حصّوں سے آئے ہوئے تارک الوطنوں کی یا بعد میں سرحد پار کے وحشیوں کی۔

آخرکار رومی سلطنت ایک بے تہذیب تمدّن کی ہیبت ناک تقدیر بن کر رہ گئی۔ ایسا تمدّن جو محض ظاہری شان و شوکت اور عیش و نشاط کی کھوکھلی نمائش تھی جس کے اندر بے اندازہ خودغرضی اور بداخلاقی چھپی ہوئی تھی۔ روم نے دُنیا کی لوٹ کا مال نہ صرف اپنی آبادی پر صرف کیا بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی غنیمت کے حصّے سے محروم کر کے موجودہ نسل ہی کو نہال کیا۔ خاندان کے متعلق اور مستقبل کے حال پر حقوق کے متعلق روم اور چین ایک دوسرے کی ضد ہیں، چناں چہ روم فنا ہو گیا لیکن چین ابھی تک زندہ ہے۔

سرحدیں اسی عرصے میں جب کہ رومی نسل کا چراغِ سحری بجھا چاہتا تھا رومی فوج سرحدوں کی مدافعت کے لیے روز بہ روز ناموزوں ہوتی گئی۔ یہ فوجیں بہت ہی کم زور اور چھوٹی ہوتی گئیں۔ رومی فوج کا زیادہ سے زیادہ حصّہ، سلطنت کے دور دراز حصوں کے رہنے والے یا سلطنت سے باہر کے وحشیوں پر مشتمل تھا۔ چوں کہ وحشیوں کی یہ فوج غیر ملکی کرایے کی فوج تھی اس لیے جب کبھی اس کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس سے زیادہ تنخواہ یا اور زیادہ لوٹ کا موقع ہے تو وہ ہمیشہ بغاوت یا خانہ جنگی پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ رومیوں نے ان وحشیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر کے ناقابلِ تلافی حماقت کی۔
" ان لوگوں کو فنونِ جنگ سکھاتے، انھیں سلطنت میں اِدھر اُدھر خوب

گھمایا اور ان لوگوں کو اچھی طرح سکھا پڑھا کر واپس بھیج دیا"۔ اس طرح سلطنت نے اپنے پیر پر آپ ہی کلہاڑی ماری۔ ایک نازک موقع پر تو فوجوں میں غلام تک بھرتی کیے گئے تھے۔

اس کے علاوہ رومی سلطنت کی بڑی سرحدیں مدافعت کے لیے بے حد غیر موزوں تھیں۔ یہ غیر معمولی طور پر طویل تھیں، اور قدرتاً مضبوط نہیں تھیں۔ شمال مشرقی سرحد کے وسط اور جنوب میں پھیلا ہوا خود اطالیہ سے خوف ناک حد تک قریب جرمنی کا ملک واقع تھا۔ اس وحشی ملک میں خوف ناک قبیلے آباد تھے۔ یہ قبیلے مطیع نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ہمیشہ منتظر رہتے تھے کہ جیسے ہی رومی حکومت کا ہاتھ کم زور پڑے اور مشرقی دباؤ بہت شدید ہو جائے، تیزی سے خود سلطنت کے قلب پر ضرب لگائیں۔

اچھی سڑکوں کے سوا رومیوں نے نہ اپنی مدافعت اور رسل و رسائل کے انتظامات میں یونانیوں کی سائنٹی فک ایجادوں کو استعمال کیا اور نہ ان کو آگے بڑھایا۔ تجارت اور فوری نقل و حمل کے لیے انھوں نے بحرۂ روم کو بھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا حالاں کہ یہ ان کی سلطنت کی بنیاد اور مرکز تھا۔ ان کی فوجیں خشکی سے گزرتی تھیں۔ ان کے جہاز بھدے اور ناکارہ ہوتے تھے۔ بحری قزاقی گویا ایک مستقل طاعون بن گیا تھا۔ وحشیوں کو بغیر کسی بحری لڑائی کے بحیرہ روم کے مغربی حصے کا مالک بننے دیا گیا۔ فوجی مظالم، عیاشی اور نسلی خودکشی نے لوگوں کے دماغوں کو بالکل بے حس کر رکھا تھا۔

اپنے اصلی مفہوم میں حب وطن وہاں ناپید ہو گئی تھی کیوں کہ لوگوں کی بڑی تعداد کے خیال میں سلطنت اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس کے لیے جنگ کی جائے، بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک نہایت نفرت انگیز حریف تھی

جو انسانیت کو کچلے ڈال رہی تھی۔ یونانیوں نے آزاد شہریت کا جو مفہوم سمجھایا تھا، مدت ہوئی اسے بھلایا جا چکا تھا۔ سیاحت ممنوع قرار دی گئی[۵۱]۔ کوئی شخص اس ڈر سے اپنا مکان بھی نہیں بدلتا تھا کہ وہ سرکاری محصول وصول کرنے والوں سے روپوشی کا ملزم قرار دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے دل حقیر مقامی اغراض و مقاصد میں پھنسے ہوئے تھے، مملکت ان کے لیے صرف ایک بے رحم ظالم بن گئی تھی، یہ انھیں لوٹتی اور ان کے گلے کاٹتی تھی اور وحشیوں کے حملوں کی مدافعت سے عاجز تھی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عوام کے لیے وحشی نجات دہندہ بن کر آئے تھے[۵۲]۔

رومہ کا زوال

آخر کار وحشی حملہ آوروں کی موجوں نے رومی سلطنت کو بالکل غرق کر دیا۔ رومیوں کے زنگ خوردہ تمدن کی باقیات کو برباد کرکے صاف کر دینے میں وحشیوں نے انسانیت کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

یہ حملہ آور پہلی مرتبہ خطرناک طور پر ۲۴۷ء میں نمودار ہوئے۔ اس وقت گاتھ نامی ایک جرمن قبیلے نے شمال سے آکر دریائے ڈینیوب کو پار کیا، ڈےسیا کے رومی صوبے (موجودہ رومانیا اور ٹرانس لونیا) کو تباہ کر ڈالا۔ اور خود شہنشاہ ڈےسی ایس کو شکست دے کر اسے قتل کر دیا۔

اس کے بعد سے سلطنت کو بہت کم چین نصیب ہوا۔ قبیلے کے بعد قبیلے اور حملے کے بعد حملے کا سلسلہ بندھ گیا۔ بعض وقت پہلے حملہ آوروں نے

---

۵۱ "یورپ قرونِ وسطیٰ میں" صفحہ ۱۹ مصنفہ ڈے ڈس۔

۵۲ اس حصے میں ویلز کی کتاب "اوٹ لینن آف ہسٹری" سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

جو اب سلطنت میں آباد ہو گئے تھے، روما کی طرف سے نئے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ بعض وقت انھوں نے بغاوت کی، اور اپنی فوجوں کے ساتھ نئے دشمن سے جا ملے۔ لیکن سرحدیں مستقل طور پر اندر کی طرف ہٹتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ ۴۱۰ء میں الارک نامی گاتھ اطالیہ میں در آیا اور خود شہر روما کا محاصرہ کر لیا۔

اس کے بعد منگولی ہن، جو اس عرصے میں آریاؤں کو مغربی جانب دھکیل رہے تھے، آئی لا نامی ایک خوف ناک سردار کی قیادت میں سلطنت کے حدود میں داخل ہو گئے۔ ان کو گاتھوں اور رومیوں کی متحدہ فوجوں نے چالانس کی عظیم الشان جنگ میں مار بھگایا (۴۵۱ء)۔ اس جنگ میں ایک لاکھ پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ مگر یہ شکست آئی لا کو دوسرے سال اطالیہ کو برباد کرنے سے نہ روک سکی۔

اس اثنا میں وحشی قبیلے اسپین، افریقہ، فرانس اور برطانیہ میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ۴۵۵ء میں روما کو پھر تاخت و تاراج کیا۔ ۴۷۶ء میں آخری رومی شہنشاہ اپنے تخت سے دست بردار ہو گیا اور اس کے چند ہی سال بعد تھیوڈرک نامی ایک گاتھ سردار اطالیہ کے بادشاہ کی حیثیت سے اس کا جانشین ہو گیا۔

روما کا اثر دنیا پر

(۱) عالمی ریاست کا تصور۔ جن برائیوں اور بداعمالیوں نے آہستہ آہستہ رومی سلطنت کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اُن کی وجہ سے ہمیں اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر لینی چاہییں کہ روما نے کم سے کم تین اعتبار سے تمدن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے،

پہلی چیز تو یہ ہے کہ لوگوں کے دماغ عالمی ریاست کے تصور سے روشناس ہو گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ تصور پہلی مرتبہ سکندر کی مختصر اور شاندار زندگی میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن روما کے کم و بیش پانچ سو سال تک بحیرۂ روم کے ملکوں اور شمال مغربی یورپ کا سرتاج بنے رہنے کے دوران میں عالمی ریاست کا تصور انسانیت کے تصورات کا ایک نہایت معمولی تصور بن گیا تھا۔ شہنشاہوں کی عالمی حکومت میں سیکڑوں برائیاں تھیں جن سے تہذیب کو سخت نقصان پہنچا اور آزادی مفقود ہو گئی۔ لیکن عالمی حکومت نے لوگوں کے دل میں یہ عظیم تصور عمیق طور پر بٹھا دیا کہ حقیقت میں انسانیت ایک ہی ہے اور یہ کہ اسی طرح لوگ ایک ہی سیاسی نظام کے تحت امن و چین اور باہمی اتحاد کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ابھی تک انسانیت بے تابی کے ساتھ کوشش کر رہی ہے کہ اس تصور کو پھر حاصل کر لے اور اسے عملی جامہ پہنائے۔ اگرچہ اس میں بہت کم کامیابی ہوئی ہے۔

بعد کی رومی سلطنت میں لوگوں کی جبلتوں اور سرگرمیوں کو دنیا کی خدمت کے لیے آزادانہ طور پر پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا گیا کیوں کہ وہاں آزادی یا تو سرے سے تھی ہی نہیں، اور اگر تھی بھی تو بہت ہی محدود تھی۔ جبلتیں وقتی فائدے اور لذت کے حصول کی کمینہ اور خود غرضانہ کشمکش میں مبتلا تھیں۔ یہی کشمکش رومی نسل پر تباہی لانے کا باعث ہوئی اور اسی نے رومی نسل کو نیست و نابود کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود مغربی دنیا کئی نسلوں تک ایک ہی بنی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اب تک رومی سلطنت کو اس بات کی ایک مادی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ اتحاد ایک ناممکن تصور نہیں ہے۔

(۲) کلیسا: دوسری چیز یہ تھی کہ عالمی سلطنت، عالمی کلیسا کا گہوارہ رہی تھی۔ عیسائیوں سے نفرت اور ان کے قتلِ عام کے باوجود عیسائی جماعت دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ اس جماعت نے اپنے آپ کو ایک مضبوط مرکزی اقتدار کے تحت منظم کر لیا تھا۔ آخرکار قسطنطینِ اعظم (۳۰۶ء سے ۳۳۷ء) اور اس کے جانشین کے عہدِ حکومت میں عیسائیت ساری مملکت کا سرکاری مذہب بن گئی۔ وحشیوں کے حملوں نے جب انسانیت کے ظاہری اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا تو مغربی عیسائیت کا روحانی اتحاد گیارہ صدیوں سے زیادہ عرصے تک باقی رہا۔ یہ مدت تمدن کے احیا میں وحشی یورپ کی تربیت کرنے کے لیے کافی طویل مدت تھی۔

اس کے علاوہ اگرچہ عام زندگی میں سلطنت کا اتحاد مستقل طور پر بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا، لیکن عیسائیت وحشیوں کی فتح سے پہلے ہی نمایاں طور پر اندرونی اخلاق کی اصلاح کر رہی تھی[1]۔ عیسائیت رومی قوم کو اپنی آپ لائی ہوئی تباہی سے بچانے کے لیے بہت دیر میں پہنچی۔ مگر اس قوم کے زوال کے بعد کلیسا کی تعلیم اور اس کے ولیوں کی مثال رومیوں کے جانشینوں کے لیے بہت ہی فائدے مند ثابت ہوئی۔

(۳) قانون: جیسا کہ ہم دیکھ آئے ہیں، دنیا کو روما کا تیسرا عطیہ قانون

---

[1] عیسائیت کی رائے عامہ نے شمشیر زنی کے مقابلوں کو بند کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ٹلی ماچیس نامی ایک سامی راہب کی ہمت اور قربانی نے اس کو ممکن کر دیا۔ یہ راہب شمشیر زنوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے دنگل میں کود پڑتا تھا۔ اگرچہ وہ خود مارا گیا، مگر اس کی موت نے ایسا اثر کیا کہ یہ "کھیل" ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔

ہے۔ یہ دستوری قانون نہیں۔ اس قسم کے قانون کے لیے جو یہ واضح کرتا ہے کہ ایک خود مختار جمہوریت کے تمام شہریوں کے لیے کس طرح بہترین طریقے پر آزادی کا تحفظ کیا جا سکتا ہے، ہم یونانیوں کے ممنون ہیں۔ روما کا قانون دیوانی اور فوج داری قانون ہے۔ یہ قانون واضح کرتا ہے کہ کس طرح ذات اور جایداد کے حقوق کا بطریق احسن تحفظ ممکن ہے۔ رومی ہمیشہ سے قاعدے اور ضابطوں کا گہرا احترام کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نہایت قابل تعریف صحت کے ساتھ انسان انسان کے درمیان انصاف کے بہترین طریقوں کو دریافت کیا، انھیں محفوظ رکھا، انھیں ترقی دی اور ان کو مستحکم کر دیا۔ رومی شہریت کو وسعت دی گئی۔ پہلے پہل یہ حقوق تمام اطالیوں کو دیے گئے اور پھر تیسری صدی عیسوی کی ابتدا میں سلطنت کے تمام آزاد باشندوں کو بھی یہ حقوق عطا کیے گئے۔ اس طرح دریائے کلایڈ سے لے کر دریائے فرات تک روما کا ایک ہی ہم آہنگ قانونی نظام عالم گیر طور پر نافذ کیا گیا۔ یکے بعد دیگرے متعدد ماہر قانون دانوں نے اسے تکمیل کو پہنچایا اور آخر کار شہنشاہ جسٹینین (۵۲۷ء۔ ۵۳۶ء) نے اس کو منضبط کر دیا۔ اگرچہ بربریت اور وحشت کے زمانوں میں اسے بہت بڑی حد تک بھلا دیا گیا تھا، پھر بھی یہ فرانس اور اطالیہ میں کم از کم ایک بگڑی ہوئی اور ناقص حالت میں باقی ضرور رہا۔ آخر کار قرون وسطیٰ اور ازمنۂ حاضرہ میں اسے پھر سے دریافت کیا گیا اور پھر ایک بار نافذ کیا گیا۔ انگلستان کے سوا آج بھی یہ تمام بڑی بڑی یورپی ریاستوں کا اساسی قانون ہے۔

مشرقی سلطنت

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ رومی سرحدیں بہت وسیع تھیں اور ان کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ شہنشاہوں نے اپنے اقتدار کو بہت دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ روما میں

کی بنائی ہوئی بڑی بڑی سڑکوں کے ہوتے ہوئے بھی فوجوں کی کافی تعداد کو تیزی کے ساتھ اُن طویل سرحدوں میں کسی مقام پر جمع کرنا ممکن نہ تھا، جہاں وحشیوں کے اچانک جمع ہونے کا خوف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ خطرہ نہ صرف شمال (یعنی شمالی انگلستان کے اطراف رومی دیوار یا دریائے رائن اور ڈینوب پر) اور شمال مشرقی سرحدوں پر تھا، بلکہ انتہائی مشرقی سرحدوں پر بھی موجود تھا۔ یہاں ایک نئی اور مضبوط ایرانی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔

شہنشاہ ڈی آک لی ٹین اعظم نے تیسری عیسوی صدی کے اختتام پر اس خیال سے کہ ان دونوں خطرناک علاقوں میں سے کسی ایک سے بھی غفلت نہ برتی جائے، شاہی اختیارات میں سے پورا پورا حصہ دے کر ایک شریکِ کار کو مقرر کرنے کی تجویز پر عمل کیا۔ شہنشاہ نے مغرب کی حفاظت کا کام اس شریکِ کار کے سپرد کیا اور مشرق کا انتظام خود اپنے ہی ماتحت رہنے دیا۔

ایک نسل کے بعد پہلا عیسائی شہنشاہ قسطنطین "بائی زن ٹیم" (ساحل باسفورس پر بحیرۂ روم اور بحرِ اسود کے درمیان) کے عمدہ محلِ وقوع سے بے حد متاثر ہوا اور یہ بحری اور بری رسل و رسائل کا مقامِ اتصال اور ایک ایسا نقطہ ہے جہاں سے مساوی طور پر ان سرحدوں کی مدافعت کا انتظام کیا جا سکتا ہے جو خطرے میں ہوں۔ چناں چہ اس نے دار السلطنت کو اس شہر میں منتقل کر دیا اور اسے نئے سرے سے تعمیر کرکے اس کا نام قسطنطنیہ رکھا۔ اس کی اس دلیرانہ سیاسی تدبیر کو کئی لحاظ سے ہر طرح حق بہ جانب ثابت کیا گیا ہے۔ چناں چہ خود روما کے زوال کے بعد قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت ایک ہزار سال تک حملہ آوروں کے مقابلے میں سینہ سپر بنی رہی۔

قسطنطین کے بعد ہی رومی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک مغربی سلطنت

کہلاتی تھی اور دوسری مشرقی۔ پہلی سلطنت روما کے زیر اقتدار تھی اور دوسری قسطنطنیہ کے۔

سلطنت کی یہ تقسیم خود بھی زوالِ روما کا ایک دوسرا سبب بنی۔ کیوں کہ ڈینوب کا پورا سرحدی خط مشرقی اور مغربی حکومتوں کے حصے میں تھا۔ لیکن جب کبھی کوئی حملہ ہوتا تو دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی پوری طرح مدد نہیں کرتا تھا۔ اس طرح جہاں سلطنت کی تقسیم نے روما کی تباہی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ وہاں قسطنطنیہ کی بقا کا بہت کچھ سامان بھی کر دیا اور قسطنطنیہ کی بقا مستقبل کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی تھی۔

مشرقی سلطنت صرف جزوی طور پر رومی سلطنت تھی۔ اس کی زبان اور اس کا تمدن دونوں یونانی تھے، اور بجز اپنے نظامِ قانون کے یہ بہر صورت بجائے آگسٹس کی سلطنت کے سکندر کی سلطنت کی جانشین تھی۔ اس نے بڑے بڑے فرماں روا پیدا کیے۔ ان میں جسٹینین کا ذکر ہم رومی قانون کے آخری ترتیب دہندہ کی حیثیت سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس کے عہدِ حکومت میں وہ ممالک جو قسطنطنیہ کے ماتحت تھے، بہت وسیع ہو گئے، اور اطالیہ و افریقہ وحشیوں سے واپس لے لیے گئے۔

عربوں کے عروج کے بعد قسطنطنیہ کئی صدیوں تک عربوں کے حملوں اور ان کے بعد سلجوقی و عثمانی ترکوں کے مقابلے میں یورپ کی مشرقی پناہ گاہ بنا رہا۔ اس سلطنت کی درباری زندگی بے شمار لغو اور بے معنی رسموں سے بھری ہوئی تھی۔ دربار میں سازشوں اور فریب کاریوں سے ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ آبادی میں قدیم یونانی فرقے وارانہ منافرت کی لعنت موجود تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود مشرقی سلطنت نے یونانی علم و تمدن کے چراغ کو ان تاریک صدیوں

تک دھندلا سا روشن رکھا اور اس روایت کو کہ دنیا میں کبھی آزادی موجود تھی، زندہ رکھا۔ وہ شہنشاہی شہر جو بربوں کی یورش کے مقابلے میں اتنے عرصۂ دراز تک ناقابل فتح بنا رہا، اسے آخر کار عثمانی ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں فتح کر لیا۔ قسطنطنیہ کی فتح سے پہلے ہی یونانی مخطوطے اور یونانی علما مغرب میں اطالیہ پہنچ رہے تھے۔ یہاں شاعری، بت تراشی، مصوری زیبائی و رعنائی کے ایک نئے نقطۂ عروج کی طرف گام زن تھی۔ قسطنطنیہ کے زوال کے بعد یہ تحریک بہت وسیع ہو گئی اور یونانی صداقت اور یونانی آزادی کا چرچا تیزی سے پھیلنے لگا۔ بادشاہ اور پاپا قدیم مخطوطے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے۔ "تعلیمِ جدیدہ" نے جو دراصل تو دریافت یونانی تعلیم تھی، یورپ کی سیاسی اور ادبی جد و جہد میں ایک نئی روح پھونک دی۔ قسطنطین نے ایک مستحکم دارالسلطنت کے انتخاب میں جو دانش مندی کی تھی اس کی وجہ سے اور اس کے بعد مشرقی سلطنت نے وحشت اور بربریت کے زمانوں میں تہذیب کے یونانی تصورات کو محفوظ رکھا۔

اطالیہ کی تقسیم جسٹینین نے اطالیہ کو وحشیوں کے ہاتھ سے نکال لیا اور اس کو مشرقی سلطنت کا ایک صوبہ بنا دیا۔ مگر اس کے صرف پندرہ سال بعد ہی آریا حملہ آوروں یعنی لمبارڈوں کا ایک زبردست سیلاب آیا۔ ان وحشیوں نے شمالی اطالیہ میں ایک وحشی سلطنت اور جنوب میں مزید دو وحشی ریاستیں قائم کیں۔ اس طرح ان وحشیوں نے جسٹینین جیسے زبردست شہنشاہ کے بہت سے کارناموں پر پانی پھیر دیا۔ چوں کہ مرکز ابھی تک مشرقی سلطنت کے علاقے میں تھا، اس لیے اطالیہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ٹکڑے ۱۸۷۰ء تک پھر باہم جوڑے نہ جا سکے۔

چھٹا باب

قرونِ وسطیٰ

جاگیری نظام وحشی فاتحوں کی پہلی موجیں رومی تمدن سے جو ان کے زمانے تک کارفرما چلا آتا تھا، گہرے طور پر متاثر ہوئیں۔ انھوں نے رومی قانون کو اختیار کرلیا اور اس میں توسیع بھی کی۔ بعض وقت یہ لوگ قسطنطنیہ کے حلیف ہونے کا دعوا کرتے تھے اور اپنی ریاستوں کے انتظامات کو اپنے پیش رو شہنشاہوں کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھالتے تھے، اور ان شہنشاہوں کی اکثر انتہائی ستایش کرتے تھے۔ اس طرح ابتدائی فاتح سرداروں میں سے ایک ابتدائی سردار نے کہا تھا:

"جب میں جوان تھا تو میری تمنا تھی کہ رومی نام و نشان مٹا دوں اور ان تمام چیزوں کو جو کبھی رومیوں کے قبضے تھیں، گاتھ کے زیرِ نگیں کردوں۔ مگر تجربے نے مجھے اس سے بہتر سبق سکھایا، وحشی اور بے لگام گاتھ کسی قانون کو مانتے نہ تھے اور اگر دولتِ عامہ کو قانون سے محروم کردیا جاتا تو یہ ایک جرم ہوتا۔ اس لیے رومی نام و نشان اور روم کے قدیم دستور بحال کرنے کے کام کو میں نے نہایت ہی خوشی سے اختیار کیا۔"[1]

---

[1] الارک گاتھ کے برادر نسبتی ارٹالف کے الفاظ جو ڈے وس کی (بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۵ پر)

لیکن یہ ابتدائی حملہ آور خود بھی دوسرے قبیلوں سے مغلوب ہو گئے۔ ابتدائی حملہ آور قبیلوں میں سے بعض نے واقعی قدیم سلطنت کی فوجوں میں تربیت پائی تھی، لیکن بعد کے دوسرے قبیلے پہلے پہل روما کے نام اور روما کی تہذیب سے بہت کم آشنا تھے اور اس کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ اس طرح ۸۰۰ء میں فرانس پر فرانک، اطالیہ کے بیش تر علاقے پر لمبارڈ انگلستان پر ٹیوٹانی قبیلے اور اسپین پر مغربی گاتھ[1] قابض تھے۔ ان نسلوں نے ایک نئی طرز حکومت اور ایک نئے سماجی نظام کی عمارت اٹھانی شروع کر دی، جس کی بنیاد قبیلے کے سردار اور امرا (جنگ میں اس کے ساتھی اور قبائلی خاندان کے صدر) قبیلے کے عام لوگوں اور مفتوحہ آبادی کے درمیان خانہ بدوشانہ تعلقات پر تھی۔ اس نئی تنظیم کا ماخذ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا ہندستانی ذات بندی کے نظام کا، جس نے کچھ ایسے ہی حالات میں نشو و نما پایا تھا۔ یعنی فاتح حملہ آور مگر تہذیب سے دور آبادوں کو ایک ایسے طریقۂ کار کی ضرورت تھی جس کے ذریعے وہ مستقل اقامت کو پیش نظر رکھ کر اپنے مفتوحہ علاقوں کا انتظام کر سکیں۔ چوں کہ حملہ آوروں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، اس لیے جاگیری نظام میں رنگ کی رکاوٹ کے باعث کسی طرح کوئی الجھن پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ جاگیری نظام نے اپنے ترقی پذیر نظام کو تقویت دینے کے لیے اپنے مذہبی عقیدوں

(صفحہ ۱۱۴ کا بقیہ نوٹ) — کتاب "قرونِ وسطیٰ میں یورپ" میں نقل کیے گئے ہیں۔

[1] یہ مغربی گاتھ حملہ آوروں کی پہلی بڑی موج سے تعلق رکھتے تھے۔ چوں کہ یہ عیسائیت کے ایک فرقے سے مجنونانہ عقیدت رکھتے تھے اور اس فرقے سے بقیہ رومی دنیا کو نفرت تھی، اس لیے یہ رومی تمدن میں حصہ لینے سے باز رہے۔

اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے طبقے کو ترقی نہیں دی۔ یہ حقیقت بھی نظام جاگیری پر مسلسل اثر کرتی رہی کہ اس نے ایک قدیم عظیم الشان تمدن کی باقیات میں پرورش پائی ہو اور عیسائیت کی تعلیم میں اخوت، مساوات، اور دنیا کی خدمت گزاری شامل ہو[1]

اس کے علاوہ جاگیری نظام کی تعمیر مسلسل لڑائیوں کے دوران میں ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک فوجی نظام تھا، اور یہ نظام مدافعت میں آسانی اور ایسی فوجوں کی فراہمی میں سہولت پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا جو ہمیشہ تازہ فتوحات کی بھوکی رہتی تھیں۔ حالات کا تقاضا تھا کہ صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے اور پُرامن طریقے سے بدیسی قبیلوں کو نئی نئی ذاتوں میں جذب کر دیا جائے۔ یہی وہ عوامل تھے جنھوں نے ہندستان میں ذات بندی کو اس قدر موثر اور قومی بنا دیا، اور لوگوں کی معاشی زندگی کو اس کے ساتھ اس قدر مضبوطی سے مربوط کر دیا۔

ان تمام حالات کے باوجود جاگیری نظام میں اس کے متعدد مخصوص نقائص کے علاوہ نظامِ ذات بندی کی تمام تباہ کن بُرائیاں موجود تھیں۔ ایسی حد بندیوں کے ذریعے جو صدیوں تک چلے برداشت کرتی اور ایک مضبوط قومی زندگی کی تعمیر میں بے دردی سے حائل رہیں، انسان کو انسان سے اور جماعت کو جماعت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ قدیم تعصب کے خطرناک بوجھ نے تمدنی ترقیوں کو محدود کر دیا۔ صنعت و حرفت کی ابتدائی منزلوں میں اگرچہ گروہ بندی کے نظام نے اس کے ارکین کے مفاد کی حفاظت

[1] محصولِ اراضی اور زرعی غلامی کا دستور زیادہ تر بعد کی رومی سلطنت سے جاگیری نظام کے ریاستی انتظام کو ورثے میں ملے تھے۔

کی، مگر خود یہی صنعت و حرفت کے طریقوں کی اصلاح میں مانع رہی۔ نسب کے غرور نے لوگوں سے اس حقیقت کو پوشیدہ کر دیا تھا کہ امیر و غریب، اعلا و ادنا سب مساوی طور پر باعزت خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

نظامِ جاگیری کے بنیادی تصوّرات

آٹھویں صدی کے وسط میں جب کہ عرب فتوحات کا خطرہ ٹل گیا، اس وقت یورپ اور خاص کر فرانس جاگیری نظام سے مضبوطی کے ساتھ منسلک تھا۔ اس کی بنیاد دو اساسی تصورات پر رکھی گئی تھی: پہلا یہ کہ ہر شخص کا ایک "لارڈ" یا آقا ہونا چاہیے۔ ایسا لارڈ اس کی نگہ داشت کرے اور اس کے بدلے میں وہ شخص لارڈ کی خدمت بجا لائے گا۔ دوسرا یہ کہ زمین کی ملکیت ہی تمام سیاسی اور سماجی تعلقات کی بنیاد ہو۔

جماعت کے لوگوں کی تمام مقبوضہ زمین کا اصلی مالک بادشاہ ہوتا تھا۔ خُدا کے بعد وہی سب سے بڑا آقا اور مالک سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ اپنے جنگی سرداروں اور بڑے بڑے خاندانوں کے سرگروہوں یعنی بیرنوں کو اپنی بعض زمینوں میں سے حصہ دیتا تھا۔ امیروں کو عطا کی ہوئی زمینوں کے معاوضے میں ان پر لازم تھا کہ وہ "ہومیج" پیش کریں۔ یہ بادشاہ کے احترام، اس سے وفاداری اور مطلوبہ خدمت کے اقرار کی علامت تھی[۵]۔ ایسی خدمت عام طور پر جنگ کے وقت فوجوں کی فراہمی کی صورت میں پیش کی جاتی تھی۔ بادشاہ کو اپنے امیروں سے مجموعی طور پر تمام اہم معاملوں میں مشورہ کرنا لازمی تھا۔

---

۵ "ہومیج" پیش کرنے کی صورت یہ تھی کہ "لگان دار" اپنے لارڈ کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر گھٹنوں کے بل جھک جاتا تھا اور اس کے بعد وفاداری و خدمت گزاری کا عہد کرتا تھا۔

قدیم آریا قبیلوں کی طرح امیر اپنے لیے یہ کرتے کہ ان کو عطا کی ہوئی زمینوں کو لگان پر اٹھا دیتے تھے۔ اس زمین کے معاوضے میں لگان داروں پر لازم تھا کہ وہ اپنے لارڈ کو "ہومیج" ادا کریں، یہ خدمت اس طرح ادا کی جاتی تھی کہ لارڈ کو بادشاہ کے لیے جو فوج فراہم کرنی پڑتی تھی، اسے یہ لگان دار بھرتی کیا کریں[1]۔

ان لگان داروں کے نیچے مفتوحہ آبادی تھی۔ یہ لوگ وہ تھے جن کی جاگیری نظام میں کوئی حقیقی جگہ نہیں تھی، کیوں کہ ان کے پاس کوئی زمین ہی نہیں تھی۔ چناں چہ یہ لوگ زرعی غلام بن گئے۔ یہ زرعی غلام ایک ہی زمین داری میں زندگی بسر کرتے اور اس کے مالک کی بلا اجرت خدمت کرنے پر مجبور تھے۔ اس کے معاوضے میں انھیں کھیتی باڑی کرنے کے لیے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دیا جاتا تھا۔

بعض ملکوں میں فاتح قبیلوں کے عوام قصبوں میں بس گئے۔ ایسے قصبوں میں زمین مشترکہ طور پر معافی دار لگان داروں کے قبضے میں رہتی تھی اور یہ لوگ اس میں کام کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ہر ایک خاندان کو زمین کی سالانہ نئی تقسیم سے اسی قدر زمین ملتی تھی کہ وہ اس کی گزر بسر کے لیے کافی ہوتی۔ ان قصبوں میں خاندانوں کے پاس زمین منتشر قطعوں کی صورت میں ہوا کرتی تھیں۔ کوئی زمین کسی مقصد کے لیے کارآمد ہوتی اور کوئی کسی اور مقصد کے لیے اس طرح سب یکساں طور پر ان مشترکہ زمینوں میں حصہ لے سکتے تھے۔

---

[1] ولیم اوّل شاہ انگلستان جیسے زبردست بادشاہ مجبور کرتے تھے کہ لگان دار بھی راست انھیں ہومیج کو پیش کریں۔ اس طرح ایسے بادشاہوں نے امیروں کے طبقے کو بہت بڑی حد تک کم زور بنا دیا تھا۔

نہ صرف زرعی غلام ہی بلکہ قصباتی باشندے بھی درحقیقت جاگیری نظام سے باہر تھے کیوں کہ آخر الذکر کی گزر تجارت پر تھی نہ کہ زمینوں کی کاشت پر۔ لیکن چوں کہ جاگیری نظام کا مطالبہ تھا کہ ہر شخص کا ایک "لارڈ" ہونا چاہیے اس لیے جس لارڈ کی زمین پر گاؤں آباد ہوتا، وہ لارڈ اس کے باشندوں سے درحقیقت زرعی غلاموں جیسا ہی برتاؤ کیا کرتا تھا۔

جاگیری نظام میں یہ ضروری تھا کہ مرتبہ، اعزاز اور زمین باپ سے بیٹے پر منتقل ہوا کرے۔ جرمنی اور فرانس کی طرح بعض ملکوں میں امیروں کی جایداد مساوی طور پر بیٹوں پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔ ان سب بیٹوں کو بھی امارت کا درجہ حاصل رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جایداد کی تقسیم در تقسیم ہونے لگی اور امیروں کا ایک ادنیٰ درجے فلاکت زدہ طبقہ پیدا ہو گیا۔ اس کے برخلاف انگلستان میں صرف بڑا بیٹا ہی امیر سمجھا جاتا تھا اور وہی پوری جایداد کا تنہا وارث ہوتا تھا۔

جاگیری نظام کے امیر خود اپنے موروثی حقوق اور مرتبے کے بارے میں جیسے سخت تھے، ویسے ہی موقع ملنے پر اپنے اقتدار کو بڑھانے اور بادشاہ کو اس حق سے کہ وہ اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے کو اپنا وارث بنائے، محروم کر دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ یعنی وہ بادشاہت کو موروثی بننے سے روکنا چاہتے تھے۔ امیروں نے اس قدیم اصول کو مستقل اور موثر بنانے کی کوشش کی جس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ اس کی رو سے امیر بادشاہ کو منتخب کیا کرتے اور وہی اس کو معزول بھی کر سکتے تھے۔

جاگیری نظام کی خرابیاں

جاگیری نظام کی خوبی اس کی سادگی تھی۔ اس نے وحشت و بربریت کے زمانے میں ریاستی انتظام، مدافعت اور عدالت کے لیے ایک سرسری اور فوری

طریقۂ کار مہیا کیا۔ ہر لارڈ کا نہ صرف یہ فرض تھا کہ وہ بیرونی دست درازیوں سے اپنی رعایا کی حفاظت کرے، بلکہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق ان میں انصاف بھی کیا کرے۔ جاگیری نظام نے اپنے ایک مخصوص بھدّے سے اصولِ اخلاق کی تعلیم بھی دی۔ یعنی خیال یہ تھا کہ جس طرح ایک شخص کو کچھ فرائض اور خدمت انجام دینے ہیں، ویسے ہی اسے کچھ حقوق طلب کرنے کا بھی حق ہے۔ اور طاقت ور کا فرض ہے کہ اپنے کم زور متعلقین کی حفاظت کرے۔ لیکن خدمت گزاری کا یہ مفہوم جو اس طرح سکھایا گیا، خطرناک طور پر تنگ اور محدود تھا۔ اور جاگیری نظام کی خرابیوں کا پلّہ اس کی خوبیوں سے زیادہ بھاری تھا۔ اس نظام نے ایک دوامی اور خود مختار حکومت میں زمین داروں کی محدود جماعت کو استحکام بخشا۔ ان زمین داروں کا ہمیشہ سے یہی چلن رہا کہ بادشاہ کے جوئے کو اپنی گردن سے اُتار پھینکیں، اور خود مختار جابر بن جائیں۔ ساوی عالم گیر قانون کی حکومت بھلا دی گئی اور ہزاروں مقامی رسم و رواج جو لارڈوں کی حسبِ مرضی نافذ ہوئے تھے، یورپ بھر میں رائج ہوگئے۔ صنعت و حرفت اور تعلیم سے نفرت کی جاتی تھی کیوں کہ صرف سپہ گری ہی ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔

منظم حکومت کا مرکزی اقتدار، ریاستیں اور اقتدارات عطا کرنے اور حریص امیروں کی مسلسل بغاوتوں کی وجہ سے بے حد کم زور پڑ گیا تھا۔ جنگ فتوحات اور لوٹ ہی پر امیروں کی زندگی کا دار مدار تھا۔ ہر لارڈ کو اپنے پاس تنخواہ یاب سپاہیوں کی ایک جماعت رکھنی پڑتی تھی تاکہ جب کبھی بادشاہ کو ان سپاہیوں کی ضرورت ہو، یہ تیار رہ سکیں۔ اس خوں ریز زمانے میں ایسی خانگی فوجوں کو قابو میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا وہ یہ کہ ان

کے لیے مہموں اور لوٹ کا سامان مہیا کیا جائے۔ جاگیری یورپ ظالم اور لٹیرے بیرنوں کے قلعوں اور گڑھیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان بیرنوں کی جوع الارض اپنی جدید ریاستوں کے حصول اور اگر ممکن ہو تو اپنے سے بڑے لارڈ کی ماتحتی سے آزادی حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد نے آئرستان سے لے کر فلسطین تک تمام ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

جاگیری نظام اپنے بہترین زمانے میں ایک سخت ذات بندی کا سماجی نظام تھا۔ اس نظام کے ماتحت تمام طبقے زندگی بسر کرتے اور اپنے جداگانہ مخصوص آبائی دائروں میں کام کیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں تباہی لانے والی خفیہ قوتوں کی طرف سے طوائف الملوکی پیدا کر دینے کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا۔ جاگیری نظام اپنے بدترین زمانے میں کم زور بادشاہ کے ماتحت قتل، لوٹ مار اور غارت گری کا ایک ہول ناک منظر تھا۔ یہ ظالم اور خود غرض اشرافیہ کی ایک زبردست طوائف الملوکی تھی اور ان کے ذلیل اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے جاری تھی۔

نظامِ جاگیری سے دست و گریباں ہونے والی قوتیں

تقریباً سات سو سال تک جاگیری نظام یورپ کے بڑے حصّوں پر مسلّط رہا۔ پندرھویں صدی کے اختتام پر طاقت ور قومی بادشاہوں کے عروج کے ساتھ ہی کہا جا سکتا ہے کہ یورپی زندگی میں جاگیری تصوّرات اور مرکزی فوجوں کی فراہمی کا کام ختم ہو گیا۔ مگر اٹھارھویں صدی کے اختتام تک اس کے بہت سے ادارے باقی تھے۔ فرانس جیسے روشن خیال ملک میں بھی یہ ادارے قدیم زمانے کی یاد تازہ کر رہے تھے اور دوسرے مقاموں پر تو یہ

کہیں زیادہ طاقت ور تھے ۔ خود ہمارے زمانے میں جاگیری نظام کی روایات اب تک اتنی با اثر ہیں کہ انھوں نے ایسے ملکوں میں جو کئی اعتبار سے کافی تمدنی ترقی حاصل کر چکے ہیں، وہاں بھی آزادی کے پیروں میں بیڑی ڈال رکھی ہے ۔

ایک ایسے برِ اعظم کو جو کسی زمانے میں یونانی آزادی کے خواب دیکھ چکا تھا، اس کی وحشیانہ گرفت سے نجات دلانے کے لیے رفتہ رفتہ بہت سی قوتیں آپس میں متحد ہو گئیں ۔

مقدّس رومی سلطنت | ان دنوں جب کہ جاگیری نظام ابھی تشکیل پا رہا تھا، فرانکوں کا ایک زبردست بادشاہ شارلی مین (۷۷۱ء ۔ ۸۱۴ء) نمودار ہوا ۔ یہ چارلس مارٹل کا پوتا تھا جس نے ٹور کی لڑائی میں عربوں کو شکست دی تھی ۔ اس کے باپ پے پن نے رومہ کو لمبارڈوں کے حملے کے خطرے سے نجات دلائی تھی اور پوپ (رومہ کا بشپ) کو وسط اطالیہ کا وہ علاقہ عطا کیا جس کو لمبارڈوں نے مشرقی سلطنت سے حال ہی میں فتح کیا تھا ۔ یہی علاقہ بعد میں پاپائی ریاستیں کہلایا، اور ان کا ہدیۂ عطیۂ پاپن' کے نام سے مشہور ہوا ۔ اطالیہ کے اندر ایک جُداگانہ ریاست کی حیثیت سے اس کے وجود نے اطالوی اتحاد کو اور بھی مایوس کن بنا دیا اور کئی صدیوں کے بعد بھی یہ ریاست اتحاد کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ثابت ہوئی ۔

شارلی مین نے اپنے باپ سے ایک وسیع سلطنت ورثے میں پائی ۔ یہ سلطنت موجودہ فرانس، نادرلینڈ اور جرمنی کے مغربی حصے پر مشتمل تھی ۔ شارلی مین نے اس سلطنت کو خاص کر جرمنی اور اسپین میں اور بھی وسعت

دی۔ اطالیہ میں لمبارڈوں کو زیر کر کے شارلی من ان کا بھی بادشاہ بن گیا۔ سلطنت کے علاوہ اس نے اپنے باپ پے پن سے یہ خیال بھی ورثے میں پایا تھا کہ پوپ کا دوست بنا رہنا چاہیے اور اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اس وقت تک پوپ مغربی اور جنوبی یورپ میں مسیحی کلیسا کا صدر تسلیم کیا جانے لگا تھا[1]۔ اس خیال کے تحت شارلی من نے اپنے باپ کے عطیے کی تجدید کی اور پاپائی نظام سے دوامی دوستی کا معاہدہ کیا۔ آخرکار ۸۰۰ء میں پوپ نے رومیوں کے شہنشاہ کی حیثیت سے روما میں اس کی تاج پوشی کی رسم ادا کی۔ اس طرح پوپ پر پھر ایک بار ایک رومی شہنشاہ مسلط ہو گیا۔ اس تسلط کو اس نے ۱۸۰۶ء تک برائے نام ایک ہزار سال تک برقرار رکھا۔

لیکن نئی رومی سلطنت پرانی سلطنت سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے تو یہ کہ یہ سلطنت کلیسا اور اس کے مذہب کی حمایت اور توسیع کے لیے وجود میں آئی تھی اور اسی وجہ سے وہ مقدس رومی سلطنت کہلاتی تھی۔ پوپ اور شہنشاہ میں اکثر نزاع برپا رہتی اور وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے، لیکن اس کا اثر سلطنت کے تقدس کے نظریے پر کچھ نہ پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ روما (جہاں شہنشاہوں کی تاج پوشی کا ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا) ہی برائے نام دارالسلطنت رہا، تاہم اقتدار کا مرکز ہمیشہ کوہ آلپس کے شمال میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے شہنشاہوں کو اطالیہ میں برائے نام اقتدار حاصل رہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ من چلے شہنشاہ اطالیہ میں اپنے اقتدار کو زیادہ موثر بنانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے

---

[1] آگے چل کر مشرقی سلطنت کا کلیسا، جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا، مغربی سلطنت کے رومی کلیسا سے بالکل علاحدہ ہو گیا۔

اور ان کوششوں میں اطالیہ مدتوں برباد ہوتا رہا۔ نئی رومی سلطنت سے مختلف ہونے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ دراصل جرمن بادشاہ بن گیا تھا۔ سلطنت کے لیے شہنشاہ کا انتخاب ہوتا تھا اور جرمنی کے مختلف رئیس اور سردار مل کر اس کا انتخاب کرتے تھے۔ شہنشاہ بننے کے لیے یہ لوگ ایسے شخص کا انتخاب کرتے تھے جو پہلے ہی سے جرمن فرماں روا ہوتا تھا۔ شہنشاہ کے انتخاب کے بعد وہ اس کے حلیف اور عموماً سرکش حلیف بن جاتے تھے۔ اس طرح سلطنت اطالوی سے زیادہ جرمن تھی۔ اور جاگیری نظام کی حیثیت سے اس میں بدترین کمزوریاں اور خرابیاں موجود تھیں۔

شارلی من کی سلطنت بہت جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، اور ایک زمانہ دراز تک جاگیری نظام اس کے کھنڈروں میں بے روک ٹوک پھلتا پھولتا رہا۔ بڑے بڑے امیر مطلق العنان حکمراں بننے کی ہوس اور ناجائز لوٹ مار اور ظلم و زیادتی کے لیے ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے تھے "انتراقیہ کی آزادی نے ہر طبقے کی قسمت میں مصیبت لکھ دی تھی۔ یہ خود ساختہ خودسر ظالم، تباہ کن لڑائیوں میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ سب سے زیادہ بدترین چیز ان کی پھوٹ اور شخصی تفوق و برتری کے لیے ذلیل سازشوں میں ان کا انہماک تھا۔ اسی چیز نے یورپ کو غیر مہذب حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔"

چناں چہ نویں صدی میں وحشی حملہ آوروں کی ایک دوسری موج اٹھی۔ اسکنڈی نیویا کے ڈینوں اور نارتھ مینوں (جو بعد میں فرانس میں نارمن کہلائے) نے یورپ پر شمال سے حملہ کیا اور ادھر منگولی ہنگریوں یا میگ یاریوں نے مشرق سے حملہ کر دیا۔ اسی اثنا میں سمندری عرب حملہ آور

جنوب میں بحرہ روم کے ساحلوں کو تسخیر کر رہے تھے۔ اس لیے جب ہنری فولر (۹۱۹ء ۔ ۹۳۶ء) نے جرمنی کا بادشاہ بن کر وحشیوں کے حملے اور جاگیری خانہ جنگی کے انسداد کی تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں، تو یورپ کی قومیں خوش ہو کر اس کے لیے تیار ہو گئیں۔ دسویں صدی کے وسط میں ہنری کے بیٹے آٹو اعظم نے ہنگروی حملہ آوروں کو شکست فاش دی۔ چند سال بعد وہ اطالیہ میں داخل ہوا، اور روما میں شہنشاہ کی حیثیت سے اس کی تاج پوشی کی رسم انجام دی گئی۔ جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، اس کے بعد سے مقدس رومی سلطنت ناقابلِ تفریق طور پر جرمن شہنشاہی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ شہنشاہ جو درحقیقت جرمن تھا جرمن ہی رہا۔ اسے اور دوسرے بادشاہوں کے علاوہ اطالیہ پر بھی سیادت حاصل تھی، اور یہ اکثر حقیقی مفہوم میں کلیسا کا محافظ بھی ہوتا تھا۔

گیارھویں صدی میں ہنری سوم نے مشرق کی جانب سلطنت کو وسعت دی۔ اس کے بعد اسی صدی میں تفوق و برتری کے جھگڑے میں سلطنت پاپائی نظام کے ساتھ اُلجھ گئی جو پوپ گری گوری ہفتم کے ماتحت بے حد طاقت ور ہو گیا تھا۔

بارھویں صدی میں سلطنت نے اپنے تفوق اور اپنے مرتبے سے کام لے کر جرمن جاگیری نظام کی بدنظمی کو روکنے کی بڑی اچھی خدمت انجام دی۔ کچھ عرصے تک اس نے صلیبی محاربات کی تحریک کی رہبری بھی کی ہے۔ تیرھویں صدی میں فریڈرک دوم (۱۲۱۲ء ۔ ۱۲۵۰ء) نے عارضی طور پر بیت المقدس پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔ منگول حملہ آور جنھوں نے فاتح اعظم چنگیز خاں کے جانشینوں کے ماتحت مشرقی یورپ کو تاخت و تاراج کیا تھا،

ان کے مقابلے میں سلطنت نے حصہ بھی لیا تھا۔ لیکن اس تلخ اور طویل جھگڑے میں کہ آیا پاپائی نظام کو یا سلطنت کو زیادہ سیاسی اقتدار حاصل ہو، یکے بعد دیگرے پاپاؤں کا مقابلہ کرتے کرتے سلطنت تقریباً بالکل بے جان ہو گئی تھی۔

سولھویں صدی میں چارلس پنجم کے عہد میں سلطنت نے پہلے تو کافی قوت حاصل کر لی تھی۔ لیکن بعد میں اسی شہنشاہ کے ماتحت فرانس کے ساتھ طویل جنگوں اور کیتھولکوں اور پروٹسٹنوں کی مذہبی نزاع کے تصفیے میں ناکامی کی وجہ سے سلطنت خطرناک طور پر کمزور ہو گئی۔ اسی ناکامی نے جرمنی کے جاگیری رئیسوں کے مرتبے کو شہنشاہ کے مرکزی اقتدار کے مقابلے میں قوی کر دیا۔ ان میں سے بہت سے رئیس تو عملاً خود مختار حکمراں بن بیٹھے۔

سترھویں صدی میں شہنشاہ نے جس کی اصلی قوت اس وقت اسٹریا میں تھی، خوف ناک تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸ء تا ۱۶۴۸ء) میں اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس لینے اور رومن کیتھولک فرقے کے حق میں فیصلہ کر کے ان مذہبی جھگڑوں کا خاتمہ کرنے کی بڑی جان توڑ کوشش کی لیکن یہ کوشش ایک تباہ کن ناکامی ثابت ہوئی۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں ترکوں کے بے پناہ حملوں سے بھی سلطنت نیم جان ہو گئی تھی۔ ترکوں نے ۱۵۲۹ء میں ہیپسبرگ کے شاہی خاندان کے پایہ تخت ویانا کا محاصرہ کر لیا۔ تاہم غیر متحد جرمنی کو اس تازہ ایشیائی حملے سے بچانے میں شہنشاہ نے یورپ کی سب سے زیادہ اہم خدمت انجام دی۔

سلطنت کی خدمات

مقدس رومی سلطنت کے اندر یہ خیال کارفرما تھا کہ برِاعظم یورپ کو پوپ کی روحانی

اور شہنشاہ کی دنیوی سیادت کے ماتحت ایک عالمگیر ریاست میں دوبارہ متحد کر دینا چاہیے۔ یہ تصور کسی وقت بھی ثمر مند ِ معنی نہ ہو سکا۔ پہلے جاگیری نظام بہت زیادہ قوی تھا اور بعد میں قومیت بہت زیادہ قوی ہو گئی۔ اس کے کے علاوہ شہنشاہی قوت اس قدیم خانہ بدوشانہ آریائی تصور سے وابستہ تھی کہ بادشاہ (یا اس صورت میں شہنشاہ) کا انتخاب اس کے امیروں کو کرنا چاہیے۔ اسی تصور کی وجہ سے شہنشاہیت خود اپنے ہی مرکز میں مفلوج ہو کر رہ گئی۔

خود سلطنت کا اصلی گھر جرمنی کبھی متحد نہ ہو سکا، بلکہ بارھویں صدی کے بعد طوائف الملوکی کے گہرے گڑھے میں جا پڑا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پروٹسٹنٹ اصلاح نے جرمن رئیسوں کو مزید طاقت اور اثر دے کر اس طوائف الملوکی کو اور تقویت پہنچائی۔ چناں چہ تیس سالہ جنگ میں اسی طرزِ عمل کو خوب ترقی دی گئی۔ جب تک فریڈرک اعظم شاہ پروشیا کے طاقت ور ہاتھوں نے اٹھارویں صدی میں اس مقصد کو جس کے حصول کی کوشش میں بہت سے شہنشاہ ناکام رہ چکے تھے، حاصل کرنا نہ شروع کیا، اس وقت تک یہی حال رہا۔ یہ کام اس وقت تک مکمل نہ ہو سکا جب تک ۱۸۷۱ء میں جرمنی اچھی طرح متحد نہ کر دیا گیا۔

اگرچہ کم زور شہنشاہ جرمن جاگیری رئیسوں کی از کار رفتہ بساط کے شاہ شطرنج بنے ہوئے تھے، تاہم طاقت ور شہنشاہوں نے اطالیہ پر اقتدار حاصل کرنے کی بے حاصل حرص کے باوجود جرمن جاگیری نظام کی برائیوں کی کافی روک تھام کی، اس لیے ہم انھیں سلطنت کو ایسی قوتوں میں تقسیم کر دینے میں حق بجانب ثابت کر سکتے ہیں جو یورپ کو جاگیری نظام کی وحشیانہ

گرفت سے نجات دلانے کے لیے متحد ہوگئی تھیں۔ عام طور پر طاقت ور بادشاہ اپنے بعد اپنے بیٹے کے لیے انتخاب حاصل کرنے میں کام یاب ہو سکتا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ شہنشاہی اقتدار اکثر صورتوں میں حکمراں خاندان ہی کے کسی رکن کو عطا کیا جاتا تھا۔ اس طرح عالم گیر حکومت کے خیال کو زندہ رکھا گیا۔ سارا یورپ جانتا تھا کہ سلطنت میں ایسی قوت گو کتنی ہی بھدی اور کم زور سہی، موجود ضرور ہے جو معمولی جاگیری جماعت کی خود غرضانہ اور کوتاہ بیں ظلم و ستم کے مقابلے میں ایک وسیع اور اعلا مقصد کی پشت پناہ ہے۔

ایک دل چسپ حربہ جس کو طاقت ور شہنشاہوں نے جاگیری نظام کے مقابلے میں اس کے بدترین زمانے میں استعمال کیا، وہ "زمین داری امن" تھا۔ عام طور پر یہ سلطنت کے کسی خاص حصے میں خانگی جھگڑوں اور قتل و غارت گری کو روکنے کا محض ایک حکم ہوتا تھا۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں دو شہنشاہوں یعنی فریڈرک باربروسہ اور اس کے پوتے فریڈرک دوم نے "زمین داری امن" کے دوامی محصول عائد کر دیے اور یہ جاگیری نظام کے ظلم و ستم کے قطعی انسداد کے لیے مستقل قانونی ضابطے بنا دیے گئے۔ اس زمانے میں یہ ضابطے ناقابلِ عمل سمجھے جاتے تھے، لیکن انھی قوانین نے ظلمت میں نور کی ایک کرن دکھلائی۔

پاپائی نظام

ایک دوسری زبردست قوت جو جاگیری نظام کے انسداد میں کام کر رہی تھی، قرونِ وسطیٰ کا کلیسا تھا۔ یہ مقدس رومی سلطنت سے کہیں زیادہ اہم اور کہیں زیادہ با اثر اور قوی تھا۔ گیارھویں صدی کے زبردست پاپائی مدبر گری گوری ہفتم کے عہد میں کلیسا تمام دنیوی حکومتوں اور فرماں رواؤں پر مذہب کی کامل فضیلت

کا حامل تھا۔ یہ کلیسا مرکزی طور پر پاپائی نظام کے ماتحت منظم و متحد کیا گیا تھا۔ گری گوری نے اپنے زمانے کے تمام فرماں رواؤں پر اپنے غیر معمولی تفوق کا سکہ بٹھا رکھا تھا۔ اس نے ہنری چہارم جیسے زبردست شہنشاہ کو کلیسائی حقوق سے محروم کر دیا،[1] اور اس کی رعایا کو اس کے احکام کی بجا آوری سے آزاد کر کے ہنری کو اطاعت پر مجبور کر دیا تھا۔ جب ہنری معافی کا خواست گار ہوا تو گری گوری نے اس کو ملاقات کا موقع عطا کرنے سے پہلے کیا نوسا کے ایک قلعے میں جہاں پوپ ٹھیرا ہوا تھا، انتظار کروایا۔ اس زمانے کے پوپ کی ذات میں عالم گیر فرماں روا اور بڑے سے بڑے ارضی بادشاہ سے زیادہ سطوت و عظمت صاف طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ یہ فرماں رواں وہ تھا جو دور دور تک مذہب اور انسانیت کے احکام جبراً نافذ کر سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یورپ پھر ایک بار عالمی مملکت کے تصور کو قدیم رومی فوجی استبداد کے ماتحت نہیں، بلکہ ایک روحانی قوت کے ماتحت جو محبت، اخوت اور مساوات کے مذہب کی نمایندہ تھی، حقیقت کا جامہ پہنانے والا تھا۔

پاپائی نظام عظمت کے اس منتہا کو طویل تدریجی ارتقائی منازل طے کر کے پہنچا تھا۔ پوپ اس بات کا دعوا کرتے تھے کہ سینٹ پیٹر کو حضرت عیسیٰؑ نے اپنے متبعین میں سب سے اونچا درجہ عطا فرمایا ہے اور سینٹ پیٹر روما کا پہلا پاپ بن گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی زمانے ہی میں سلطنت روما کے بشپ یعنی پوپ کو ہنچایت، مرافعہ اور مسیحی روایات کی شرح و تفسیر

---

[1] کلیسائی حقوق سے محروم کر دینے سے مراد کلیسا سے اخراج اور اس کے تمام دینی اور دینوی فوائد سے محرومی تھی۔

کے خاص خاص اختیارات عطا کیے گئے۔ پانچویں صدی کے وسط میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شہنشاہ روما کو ایسے مسائل میں پوپ کے فیصلوں کو قانونی فیصلوں کی حیثیت سے تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد کلیسا کی تبلیغی کوششوں میں مرکزی منتظم قوت کی حیثیت سے پوپ نے قدیم سلطنت کے وحشی حملہ آوروں اور خصوصاً انگلستان اور قدیم سلطنت کے سرحدوں سے باہر جرمنی میں اور بھی اہمیت حاصل کرلی۔ راسخ العقیدہ فرانک بادشاہوں کے ادب و احترام اور امداد کی بدولت اس نے بڑا رتبہ پیدا کرلیا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ پوپ ہی نے شہنشاہ شارلی من کے سر پر تاج رکھا تھا۔ اس تاج پوشی سے یہ خیال قطعی طور پر قائم ہوگیا کہ پوپ کی روحانی قوت دنیا کی سب سے زیادہ صاحب جبروت مادّی قوت سے بھی بالاتر ہے۔ پوپ کو شہنشاہ گر تک بھی دیکھا گیا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وسطی اطالیہ میں ایک سلطنت کا عطیہ پیش کرنے سے اس وقت تک پاپائی نظام بہت قوی ہوگیا تھا۔ پے پن کی مادّی قوت نے پوپ کو اپنے روحانی دعاوی کے مستحکم کرنے میں بڑی مدد دی۔ پوپ نے نام نہاد "عطیۂ قسطنطین" سے بھی جو بعد میں جعل ثابت ہوا، اپنے دعووں کو تقویت پہنچائی۔

دسویں صدی میں روما میں آٹو اعظم کی تاج پوشی اور "کلیونیاکسی"[۱] وسیع اصلاحی نظام سے پاپائی نظام کے اتحاد نے پاپاؤں کے وقار کو اور بھی وسعت و استحکام بخشا۔ اس اصلاحی نظام نے کلیسا کو بہت سی

---

[۱] فرانس میں "کلیونی" نامی ایک خانقاہ تھی۔ اسی کے نام پر اس تحریک کا نام رکھا گیا ہے۔

برائیوں سے پاک کرنے اور اسے ہر قسم کے دنیاوی اقتدار کے دباؤ سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ بارھویں صدی کے وسط تک یورپ کے مختلف حصوں میں کلیوناک تین سو سے زیادہ خانقاہوں پر قابض تھے اور کلیسا کی کونسلوں میں ان کا اثر سب پر غالب تھا۔

گیارھویں اور اس کے بعد کی صدیوں میں مدبر پاپاؤں کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ انھوں نے اس خیال کو اہلِ یورپ کے دلوں میں راسخ کر دیا کہ کلیسا کا سلطنت سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ کسی مجلس میں صدر کا اراکین سے یا روح کا جسم سے تعلق ہوتا ہے اور یہ کہ اس کلیسا کا مطلق العنان صدر پوپ ہے۔ جب کبھی کوئی فرماں روا پاپائی احکام سے انحراف کی جرات کرتا تو اس کو کلیسا کے حقوق سے محروم کر کے، یا اس کے ملک میں ایک امتناعی حکم جاری کر کے اسے مطیع کیا جاتا تھا۔ اس امتناعی حکم کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس ملک میں کسی کو اصطباغ نہیں دیا جائے گا اور کسی کی شادی بیاہ یا تدفین کے مراسم ادا نہیں کیے جائیں گے۔ قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت کے لیے اس کے معنی یہ تھے کہ تمام آبادی نے دوزخ میں ابدی عذاب میں مبتلا ہونے کا عظیم خطرہ مول لیا ہے۔

اس طرح کچھ عرصے کے لیے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ پھر ایک بار ایک مرکزی اقتدار کے ماتحت واقعی ایک اتحادِ ملوک میں مربوط ہونے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اپنی بہت سی خرابیوں کے باوجود یہ مرکزی اقتدار رحم دلانہ اور تہذیب کی جانب ترقی کرنے والا اور طوائف الملوکی اور بربریت کے دور میں روشن خیال قیادت کا پشتی بان تھا۔

یہ تمنا ایک مختصر زمانے تک اور بھی درخشاں طور پر بڑھتی ہوئی نظر

آئی۔ جب محارباتِ صلیبی کے ابتدائی نظام کے لیے پاپائی صدا پر یورپ نے غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا تھا۔ جس وقت جاگیری نظام کی فوجیں شمال و مغرب کے انتہائی دور دراز حصوں اور اسی طرح زیادہ مہذب جنوب کے علاقوں سے کھنچ کر جمع ہوئیں اور ایک عام جوش کے ساتھ ارضِ مقدس کی فتح کے لیے بڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ براعظم یورپ پھر ایک بار ایسے حاکم کے تحت متحد ہو گیا ہے جسے زمین پر حضرت عیسیٰؑ کا نمایندہ ہونے کا دعوا تھا۔

پاپائی نظام کی ناکامی

لیکن محارباتِ صلیبی جو اس قدر شاندار اور اتنے پر خلوص ایثار کے ساتھ شروع کیے گئے تھے، ان میں صرف جزوی کامیابی ہوئی۔ عیسائی فوجوں کے قائد جاگیری نظام کے بادشاہ تھے۔ ان بادشاہوں کی زمین کے لیے ہوس اور باہمی ناچاقیوں نے محارباتِ صلیبی کا ستیاناس کر دیا۔ پاپائی دعاوی کو بارھویں اور تیرھویں صدی کی ابتدا میں شہنشاہوں کی شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے نتیجے کے طور پر جو لڑائیاں ہوئیں ان سے اطالیہ تباہ و تاراج ہو گیا۔ پوپ شہنشاہ سے، شہری امیر سے اور ایک شہر اپنے ہمسایہ شہر سے دست و گریباں ہو گیا۔ پوپ اس درجہ نیچے اتر آئے کہ انھوں نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے ظلم و زیادتی، دغابازی، جاسوسی، ایذا رسانی، قتل و غارت گری کو اپنا شعار بنا لیا۔ چودھویں صدی میں پوپ پوری طرح زبردست فرانسیسی بادشاہت کے قبضے میں آ گئے تھے۔ ان کا صدر مقام روما سے فرانس میں بمقام اے وگنان منتقل کر دیا گیا تھا۔ آخر کار پاپائی نظام کی انتخابی خصوصیت جو ہمیشہ انتہائی بلند منصوبوں کا ہدف بنی رہتی تھی، پاپائی جانشینی کے لیے نزاع کا موجب بن گئی۔

یورپ نے دیکھا کہ بہ یک وقت دو دو اور بعد میں تین تین پوپ ایک دوسرے پر اپنی روحانی بجلیاں گرا رہے ہیں۔

پاپائی رہ نمائی میں یورپی استحکام کی ناکامی کے ان تمام اسباب سے زیادہ اہم سبب قومی جذبہ اور قومی بادشاہت کا عروج تھا۔ پوپ ایک کم زور بادشاہ کو مجبور کر سکتا تھا کہ اس کے دعوے کو مانے لیکن چوں کہ ایسا کرنے سے بادشاہ کی سبکی ہوتی تھی اور بادشاہ کی سبکی سے جاگیری امیروں کی قوت میں اضافہ ہو جاتا تھا، اس لیے قومی وقار اور قومی مرکزی حکومت کی جو خواہش عوام میں پیدا ہو چکی تھی، اس کی مزاحمت ہوتی تھی۔ ایک طاقت ور بادشاہ جو اپنے امیروں کو مطیع کرتا اور قومی وقار کو بڑھاتا رہتا تھا، وہ پاپائی دعاوی کو بہ تدریج مسترد کر سکتا تھا۔ ایسا کر کے وہ اپنی رعایا سے احترام اور مقبولیت حاصل کر سکتا تھا۔ یہ رعایا وہ تھی جس میں روشن خیالی کی رفتہ رفتہ اشاعت کلیسا کے حقوق سے محرومی اور امتناعی احکام کے پاپائی حربوں کو بے اثر کر رہی تھی۔

پاپائی نظام کی خدمات

یورپ کو ایک روحانی حکومت کے ماتحت مستحکم کرنے کی زبردست کوشش میں پاپائی نظام ناکام رہا لیکن اس میں شک نہیں کہ پاپائی نظام اور کلیسا نے جس کی رہ نمائی پاپائی نظام کرتا تھا، انسانیت پر بے حد احسانات کیے ہیں۔

ہزاروں طریقوں سے کلیسا نے جاگیری نظام کی بے رحمی اور بے قاعدگی کا مقابلہ کیا۔ جاگیری نظام پر حملہ کرنے کے لیے ایک ہتھیار جو خاص طور پر فرانس میں استعمال کیا گیا، وہ "صلح خاوندی" کا ادارہ تھا۔ اس "صلح" کی رو سے جس پر قسم کھانے کے لیے تمام آدمیوں کو آمادہ کیا جاتا تھا، مذہبی خدمات انجام دینے والوں، کسانوں اور دوسرے نہ لڑنے والے لوگوں کا

قتل و خون ممنوع تھا۔ اس میں کاشت شدہ کھیتی کو برباد کرنے، مویشی کو بھگا لے جانے اور بعض مقررہ موسموں میں جنگ کرنے کی بھی ممانعت تھی۔ اسی قسم کے ایسے ہی اقرار نامے کے ذریعے ہر ہفتے، بدھ کی شام سے پیر کی صبح تک اور ہر سال کے بڑے حصوں میں ہر قسم کے خانگی لڑائی جھگڑے روک دیے گئے۔[1]

کلیسا کے تقدس اور اس کے اختیارات کی وجہ سے چھوٹے بڑے تمام جاگیری سردار اپنے لٹیرے ملازموں کو لوٹ مار سے روکنے، ناجائز طور پر حاصل کیے ہوئے منافع کو واپس کرنے اور کم از کم ظاہری شائستگی اور نظم برقرار رکھنے پر ہمیشہ مجبور رہتے تھے۔ بلاشبہ صدیوں تک کلیسا ہی یورپ کے بڑے حصے میں تہذیب کی تنہا نشانی تھی اور اسی سے متمدن زندگی کے وجود کا امکان تھا۔ اس نے تازہ حملہ آوروں، آبادکاروں اور بیرونی وحشی قبیلوں کی اخلاقی تعلیم اور ہیمی اداروں کے کام کا انتظام اپنے ذمے لیا۔ اسی کی خانقاہوں میں جہاں قدیم مخطوطوں کی نقل در نقل احتیاط و احترام کے ساتھ کی جاتی تھی، یونان اور روم کے علم و حکمت کی حفاظت کی۔ اسی کے متعلقہ مذہبی طبقہ میں تحصیل علم کی روایت ایسے وقت باقی رہی جب کہ تمام دوسرے طبقوں نے اس کو بھلا دیا تھا اور اس کی تحقیر کرتے تھے۔ بعد میں اسی کلیسا کے سایۂ عاطفت میں جامعات ظہور پذیر ہوئیں اور قدما کے علم و دانش کو پھر دن کی روشنی نصیب ہوئی۔ کلیسا کے آدمی، یا وہ لوگ جنھیں کلیسا نے تعلیم دی تھی اور کلیسا کے لیے تیار کیا تھا، ان میں سے بہت سے ازمنۂ وسطیٰ کے بڑے بڑے سیاس بنے۔ صرف سیاس ہی نہیں بلکہ یہی لوگ تلاشِ حق میں، ادبِ قدما کو زندہ کرنے میں اور قرونِ وسطیٰ کے اداروں اور تصورات پر تنقید کرنے

[1] "قرونِ وسطیٰ میں یورپ" صفحہ ۱۰۴، مصنفہ ڈے وی سن۔

میں سب سے آگے آگے تھے۔ اس طرح کلیسا نے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ اور تحریک اصلاح میں سب سے زیادہ اہم حصہ لیا ہے۔ تحریکِ اصلاح وہ زبردست تحریک ہے جسے جدید یورپ کی قرونِ وسطیٰ سے تبدیلی کی نمایاں حدِ فاصل کہا جا سکتا ہے۔

یکے بعد دیگرے صدیوں تک جاگیری نظام کے تشدد اور طوائف الملوکی کے زمانے میں کلیسا نے ہزاروں محترم اور ایثار پیشہ مرد اور عورتیں پیدا کیے اور مسلسل خاموش طریقے پر ہدایت اور اصلاح کا کام جاری رکھا۔ اپنے اسی طرزِ عمل سے کلیسا نے بربریت کو رحم و کرم کی خوبیوں اور اخوت کے مقدس قانون کے آگے اپنا سرِ نیاز خم کرنا سکھایا جو جاگیری نظام کی بے رحمی اور خود غرضی سے کوسوں دور تھا۔

اگرچہ پاپائی نظام یورپ کو اپنی قیادت میں دوبارہ متحد کرنے کی کوشش میں ناکام رہا، تاہم اس نے جاگیری نظام کو قابو میں لانے اور لوگوں کو ظلمت اور بربریت سے نکالنے کی جو کوشش کی، اس میں اسے زبردست کامیابی ہوئی۔

قصبے

ایک دوسری موثر قوت جو جاگیری نظام کی طوائف الملوکی کو روکنے کی باعث ہوئی، وہ قرونِ وسطیٰ کے قصبے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جاگیری نظام کی سماجی تنظیم میں قصبوں کے باشندوں کی کوئی حقیقی جگہ نہیں تھی، سوائے اس کے کہ زرعی غلاموں کی طرح جاگیری لارڈ کے ماتحت اس کی زمین میں بستے تھے۔ تاہم جیسے ہی وحشی آباد ہوگئے، اور تجارت اور صنعت وحرفت ترقی کرنے لگی، باشندے زیادہ سے زیادہ مال دار ہونے لگے بعض وقت جاگیری قصبوں کے "لارڈ" کو روپے کی شدید ضرورت ہوتی تھی کیوں کہ

فوجوں کو ہمیشہ رکھنے کے لیے کثیر مصارف درکار ہوتے تھے اور جاگیری جنگوں کے لیے فوجوں کو تیار کرنا کثیر نقد رقمی مطالبوں کا موجب ہوا کرتا تھا۔ اس طرح اپنے باشندوں سے قرض لے کر ضرورتیں پوری کرنے کے لیے لارڈ خوشی سے تیار ہو جاتے تھے۔ اس کے معاوضے میں لارڈ باشندوں کو ایک منشور یعنی ایک ایسی دستاویز عطا کرتا تھا جس کی رو سے یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ قصبے کو بعض معین حقوق اور آزادیاں دی گئی ہیں۔ بہت سے موقعوں پر ایسا بھی ہوا کہ جہاں مرکزی بادشاہت قوی ہوتی وہاں اپنے منشور ریاست بادشاہ سے خرید کیے جاتے تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں مشرق سے راستوں کا منتہا شمالی اطالیہ اور شمالی جرمن قصبوں میں تھا[1]۔ اس کی وجہ سے یہ قصبے بے انتہا مال دار ہو گئے تھے۔ اسی طرح نیدرلینڈز کے باشندوں نے بھی ابتدائی زمانے ہی سے تجارت اور صنعت و حرفت میں قابلِ تعریف مہارت پیدا کر لی تھی۔ چناں چہ ان علاقوں میں بہت سے قصبے اس قدر دولت مند ہو گئے تھے کہ وہ تقریباً اپنی پوری آزادی خرید لینے کے قابل تھے۔ یہی وجہ ہو کہ یہ آزاد قصبے مشہور ہیں۔

دوسرے مقاموں پر بھی شہری متعدد خاص حقوق اور مراعات خرید

---

[1] قرونِ وسطیٰ میں ایشیا کو جانے والے دو اہم راستے تھے۔ شمالی راستہ دریائے والگا اور وہاں سے بحیرۂ بالٹک کے ساحل تک جاتا تھا۔ ۱۲۴۱ء سے لگ بھگ شمالی جرمنی اور بالٹک کے اسی شہر زبردست "ہانسی ٹک لیگ" میں متحد ہو گئے تھے تاکہ اس راستے کے ساتھ ساتھ اور دوسری تجارتوں کو اپنے قبضے میں رکھیں۔ جنوبی راستہ بحیرۂ احمر یا خلیج فارس تک جاتا تھا۔ یہ راستہ خشکی میں مشرقی بحیرۂ روم کی بندرگاہوں اور وہاں سے وینس، جینیوا اور دوسرے اطالوی قصبوں کو جاتا تھا۔

رکھتے تھے۔ مثلاً انھیں اس بات کی اجازت دی جاتی تھی کہ وہ اپنے لارڈ کی زمین پر زرعی خدمت انجام دینے کی بجائے اسے صرف لگان ادا کر دیا کریں۔ دوسرے یہ کہ انھیں اجازت دی جاتی تھی کہ وہ ہاٹ اور بازار قائم کریں اور وہاں جو جھگڑے ہوں، انھیں تصفیے کے لیے لارڈ کی عدالت میں پیش کرنے کی بجائے خود ہی آپس میں ان کا فیصلہ کریں۔ اس کے بعد ان تاجروں کو اپنی ایک انجمن بنانے کی اجازت دی گئی۔ اس انجمن میں قصبے کے ممتاز تاجر شریک کیے جاتے تھے۔ اس کو تجارتی انتظامات کی غرض سے وسیع اختیارات دیے گئے تھے۔ اس کے بعد صناعوں کی انجمنیں بننے لگیں اور صنعت و حرفت کے ہر شعبے میں کام کرنے والوں کی الگ الگ جماعتیں پیدا ہو گئیں (مثلاً سناروں کی انجمن، جلاہوں کی انجمن، نان بائیوں کی انجمن) ان انجمنوں کو اوقات کار کے تعین، کام کی درجہ بندی اور کام سیکھنے والوں کی تعلیم کے انتظام اور ایسے ہی دوسرے کاموں کا اختیار حاصل تھا۔ اس طرح یہ طریقۂ عمل روز بہ روز آگے بڑھتا رہا۔ موقع ملنے پر انفرادی طور پر حقوق خریدے جاتے رہے اور اس وقت تک یہ طریقہ جاری رہا جب تک کہ تمام اہم منشوروں کی ضمانت پر ایک ٹھوس اور حقیقی آزادی حاصل نہ کر لی گئی۔

محاربات صلیبی کے طوفانی زمانے نے قصبوں کی ترقی اور منشوروں کے حصول میں بڑی تیزی پیدا کر دی۔ محاربات صلیبی کا زمانہ وہ ہے جب یورپ کے ہر ملک کے جاگیری امیروں کو ارض مقدس کے لیے فوجیں روانہ کرنے کے لیے زر کی شدید ضرورت تھی۔ اس کے بعد امیروں کے قدیم مرض یعنی طلب زر نے نہ صرف منشوروں کی فروخت کو فروغ دیا بلکہ بعض ملکوں میں زرعی غلاموں کی آزادی کا اولین سبب بھی یہی ہوا۔ ان غلاموں کو اس بات کی

اجازت تھی کہ وہ اپنے لارڈ کی زمین داریوں میں قدیم جبری طریقے پر کام کرنے کی بجائے زرِ لگان ادا کیا کریں۔ انگلستان میں بہت سے ایسے کاشت کار اپنے پاس اپنے لارڈوں کے معاہدوں کی نقلیں رکھتے تھے، جن کی رو سے ان کے کھیت ان کو عطا کر دیے گئے تھے۔ چناں چہ اسی وجہ سے یہ لوگ "نقل دار" کہلاتے تھے اور ایسی نقلوں کو کسانوں کا منشور کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں جب کہ اطالیہ میں شہنشاہ اور اس کے مخالفوں میں سخت لڑائیاں ہو رہی تھیں اور اسی عہد میں جب کہ فرانس اور انگلستان سو سالہ جنگ میں اُلجھے ہوئے تھے، جاگیری مراعات کے فروخت کا طریقہ برابر ترقی پذیر رہا۔ اور اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ تقریباً ہر ایک بڑے قصبے کو اس کا منشور حاصل نہ ہو گیا۔

شہری پنچایتیں

قرونِ وسطیٰ کے آخری زمانوں میں بہت سے بڑے بڑے شہروں کے اندر ایک طرح کی خود اختیاری جمہوری حکومت نے جگہ لینی شروع کی۔ یہ طرزِ حکومت دیکھنے والوں کو شدت کے ساتھ یونانی شہری ریاست کی یاد دلاتا تھا۔ وہ طریقہ جس سے ایسی جمہوریت قائم ہوتی تھی، عام طور پر ایک "شہری پنچایت" کا قیام تھا۔ یہ شہریوں کی ایک جماعت ہوتی تھی۔ اس کا کام اپنے جاگیری حاکموں کے ستمِ بے جا کی مدافعت کرنا اور شہر میں ایک جمہوری طرز کی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس کے لیے بار بار یہ قانون بنایا جاتا تھا کہ جو شخص اس شہری پنچایت کا رکن نہ ہو وہ شہر میں بھی نہ رہے۔

ان شہری پنچایتوں کو اپنی بقا کے لیے اکثر جان توڑ کوششیں کرنی پڑتی تھیں کیوں کہ جاگیری نظام کے ظالم لارڈوں کے نزدیک یہ نہایت نفرت

تھیں۔ اس کشمکش میں شہریوں نے آزادی کی محبت اور مساوات اور رفاہِ عام کے تصورات کو خوب ترقی دی۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پریکلز کے زمانے کی حقیقی ایتھنزی جمہوریت نے پھر سے نیا جنم لیا ہے۔ مثلاً شمالی اطالیہ کے شہریوں کو ہم نہ صرف "متوسط اطالوی طبقوں اور ایک مخصوص بے قانون قسم کے جاگیری نظام کے درمیان ایک حد فاصل بناتے" بلکہ بعض وقت انھیں بے انتہا ہمت و جرأت کے ساتھ کسی بیرونی قبضے کی کوشش کا مقابلہ کرتے دیکھتے ہیں۔ بارھویں صدی میں جب شہنشاہ فریڈرک باربروسہ نے اطالیہ میں حقوقِ سلطنت کی توسیع اور اس کی قانون بندی کرنے کی کوشش کی اور اس روحِ آزادی کو کچل دینا چاہا جو قصبوں میں پہلے ہی سے طاقت ور ہو چکی تھی تو اس کو میلان اور کریما کی شہری پنچایتوں کی شدید مزاحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ شہنشاہی فوجوں نے ان دونوں قصبوں کا محاصرہ کر کے انھیں تباہ کر دیا، لیکن آزادی کے لیے ان کی یہ جد و جہد شمالی اطالیہ کے شہروں کی "لمبارڈ لیگ" کی تشکیل کی صورت میں رنگ لائی۔ اس لیگ نے لگ نانو کی زبردست لڑائی (۱۱۷۶ء) میں شہنشاہ کی فوجوں کو فاش شکست دے کر شہنشاہ سے بہت کچھ خود مختاری چھین لی۔

بارھویں صدی کے اختتام پر فلانڈرس میں بھی چالیس دولت مند شہری پنچایتیں تھیں۔ ان کا دار و مدار زیادہ تر بیرونی بازاروں کے لیے اپنی صنعت و حرفت میں مہارت پیدا کرنے پر تھا۔ فلانڈرس کے باشندوں نے اپنے جاگیری لارڈ کاونٹ آف فلانڈرس کے مظالم اور شاہانِ فرانس کی دست درازیوں کے مقابلے کے لیے ایک سخت جنگ کی۔ کورٹ رائی کی جنگ (۱۳۰۲ء) میں انھوں نے دنیا کو پھر ایک بار دکھا دیا کہ آزادی کے نشے

سے سرشار ہوکر شہریوں کی فوج ایک جاگیری فوج کو کھلے میدان میں کس طرح مار بھگا سکتی ہو۔

فرانس اور انگلستان میں یہ قصبے خاص کر اشرافیہ کے مقابلے میں بادشاہ کے حلیف بن کر طاقت ور ہو گئے اور ایک مستحکم قومی بادشاہت کے ارتقا میں ان کی حمایت نہایت بیش قیمت ثابت ہوئی۔ فرانس میں آخر کار شہری پنچایتوں کو اس طرح زمین کا لگان دار تسلیم کر لیا گیا کہ زمین راہ براست بادشاہ سے ان کے قبضے میں دی گئی ہو، اور بادشاہ کی مرضی سے ان سے زرِ لگان اور فوجی خدمات لی جا سکتی ہیں۔ شہری پنچایتوں کا مراعات یافتہ مرتبہ اور بادشاہت سے اس کا اتحاد جاگیری اشرافیہ کے لیے ایک مستقل اور قوی خطرہ بن گیا۔ آیندہ جیسے جیسے بادشاہت قوی ہوتی گئی اور قصبے باہمی ناچاقیوں سے کمزور ہوتے گئے، بہت سے فرانسیسی شہروں نے اپنے منشور کھو دیے اور بادشاہ کی استبدادی حکومت کے ماتحت آ گئے جو اس کے شاہی کمشنروں کے ذریعے سے کی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر اوقات شہریوں نے اس تغیر کو پسند کیا ہوگا کیوں کہ اس نے ان تمام تباہ کن اور دائمی جماعتی لڑائیوں کا خاتمہ کر دیا، جن میں یہ شہری پنچایتیں مبتلا رہتی تھیں۔ انگلستان کے اندر گیارھویں صدی میں نارمن خاندان کے بانی ولیم فاتح کی مطلق العنان اور استبدادی حکمتِ عملی نے تاج کو اور دوسرے مقامات کی بہ نسبت سب سے زیادہ قوی بنا دیا تھا۔ انگلستان کو اس کی دوری اور اس کے سب سے الگ تھلگ ہونے نے اس کو مفلس بنا رکھا تھا۔ اس لیے انگلستان کے قصبے بھی عرصۂ دراز تک نسبتاً چھوٹے اور غیر ترقی یافتہ رہے۔ اگرچہ صناعوں اور تاجروں کی جماعتوں کی اعلا تنظیم کی گئی تھی، پھر بھی یہاں حقیقی شہری

پنچایتوں نے یقیناً کبھی فروغ نہیں پایا۔ لیکن تیرھویں صدی میں پارلیمنٹ کے عروج نے انگریزی شہروں کو سیاسی اہمیت دلادی۔ ۱۲۶۵ء میں پہلی مرتبہ ان شہروں کے نمایندے اور ان کے ساتھ ہر ضلع سے دو دو نائیٹ طلب کیے گئے تاکہ وہ انگلستان کے باغی گورنر ارل سائمن ڈی مان فورٹ کو محاصل کے ذریعے رقمی امداد نہ دیں۔ اس طریقے کو شاہ ایڈورڈ اول نے ۱۲۹۵ء میں باضابطہ اور مستقل کر دیا، اور اس وقت سے پارلیمنٹ کی قوت کے ساتھ ساتھ قصبوں کی قوت بھی بڑھتی گئی۔

اس طرح یورپ کے بہت سے حصوں میں عین عام جاگیری طوائف الملوکی کے زمانے میں بھی قصبے ترقی کرکے تجارت اور دولت کے مرکز بن رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بادشاہوں اور بیرنوں سے اپنے منشور خرید رہے تھے، شہری پنچایتیں قائم کر رہے تھے، اپنی خاص عدالتوں میں مقدموں کا فیصلہ کر رہے تھے اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے عہدے داروں کے تحت آزاد اور قومی جذبے کی حامل بلدی زندگی کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ جاگیری جنگیں جتنی زیادہ شدید ہوتی گئیں، اتنے ہی زیادہ قصبے ترقی کرتے گئے کیوں کہ بیرنوں کو روپے کی جتنی زیادہ ضرورت ہوتی، اتنے ہی وہ زیادہ منشور عطا کرنے پر راضی ہو جاتے تھے۔

قصبوں میں نفاق

لیکن قرون وسطیٰ کے شہر اور خصوصاً شہری پنچایتیں اپنے معائب و محاسن میں یونانی شہری ریاست سے مشابہ تھیں۔ آزادی کے معنی جماعتی دشمنی اور نفاق کی لڑائی کے سمجھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو مدد دینے کے لیے یہ شہر بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ ان کے مشترکہ دشمن یعنی جاگیری بیرن ان کے کسی ہمسایہ شہر پر جس آتے

انھیں رشک و حسد ہوتا، حملہ آور ہوتے تو یہ ان سے ساز باز کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے قومی بادشاہتیں طاقت ور ہوتی گئیں ویسے ہی قصبوں کی آزادی بھی رفتہ رفتہ سلب ہوتی گئی۔

اطالیہ میں شہروں نے یونانی آزادی کی ایک دوسری صورت میں پیروی کی کیوں کہ اندرونی نفاق نے چھوٹے چھوٹے استبدادیوں اور ظالموں کو اُبھرنے کا موقع دے دیا تھا۔ اگرچہ ان کی حکومت بعض وقت شان دار اور مقبول رہی، تاہم یہ ویسی ہی استبدادی حکومتیں تھیں جیسی کہ ان کے پیش روؤں کی۔ اطالوی قصبوں میں استبداد کا سیلاب مستقل طور پر بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ پندرھویں صدی میں صرف وینس ہی میں جمہوری ادارے باقی رہ گئے۔ اس کے بعد خود وینس کو ایک قریبی اور استبدادی حکومت کے تسلط میں آنا پڑا۔

تاہم نفاق اور ظلم و ستم میں مبتلا رہنے کے بعد ان اطالوی شہروں نے بربریت کے تاریک زمانوں کے بعد یونانی جمہوریت اور یونانی خود مختاری کے احیا کی عملی مثال دنیا کے آگے پیش کی ہے۔ اس طرح آزادی کا خمیر غیر محسوس طور پر اپنا کام کرتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ آزاد اطالوی شہر ایتھنز کے عہد زریں کی طرح فنون لطیفہ اور ادب کے گہوارے بن گئے تھے۔ استبدادی ظالم حکمراں یونانی استبدادیوں کی طرح شاعروں، مصوروں اور تعمیر کاروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتے تھے۔ اس طرح فنونِ لطیفہ کی اعلا قابلیتوں کی حیرت انگیز بیداری کا راستہ تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ نشاۃِ ثانیہ میں تحصیل علم کا احیا ہوا۔ نشاۃِ ثانیہ کے کام کے دوران میں مشہور ترین نام فلارنس کے ایک بہت بڑے شاعر دانتے

(۱۲۶۵ء، ۱۳۲۱ء) کا ملتا ہے۔

لڑائی کے جدید طریقے

جاگیری نظام کے زوال کا دوسرا اہم سبب جاگیری طریقۂ جنگ کا ناکارہ ہونا تھا۔
جاگیری نظام کی فوج میں ہر بڑا بیرن خود اپنے دستے تیار کرتا، ان کے لیے ہتھیار مہیا کرتا اور خود ہی ان کا خرچ اٹھاتا تھا۔ یہ بیرن ایک مقررہ مدّت تک خدمت انجام دینے پر مجبور تھے۔ مثلاً انگلستان میں یہ مدّت سال کے دوران میں چالیس دن تھی۔ اگر مالِ غنیمت اور خود اپنی ذات کے لیے نئی جایدادیں حاصل کرنے کے مواقع کافی دل کش نہ ہوتے تو خدمت کی مقررہ مدّت ختم ہوتے ہی یہ بیرن عموماً اپنے فوجی دستوں کو برخاست کر دیتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خواہ بادشاہ نے کیسی ہی لڑائی چھیڑ رکھی ہو، وہ ایک شرم ناک اختتام کو پہنچ جاتی تھی۔

چناں چہ نظامِ جاگیری کے ہر طاقت ور بادشاہ کو یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنے جاگیرداروں سے فوجی دستوں کی بجائے نقد رقم لیا کرے۔ عام طور پر بیرن بادشاہ کی اس خواہش پر رضامند ہو جاتے تھے۔ کیوں کہ بادشاہ کی فوجی خدمت ایک ناپسندیدہ بوجھ اور غلامی کا طوق سمجھی جاتی تھی۔

اس طرح بیرنوں کو بڑی بڑی رقموں کی فراہمی کی جو ضرورت پیش آنے لگی، اس سے قصبوں کو ان کے منشور اور زرعی غلاموں کو ان کے ٹھیکے دلانے میں مدد دی۔ اس نظام کے ماتحت بادشاہ کو جو رقمیں ملتی تھیں، ان سے بادشاہ نے تنخواہ یاب فوجیں ملازم رکھیں۔ اب چوں کہ بادشاہ ان کو تنخواہ ادا کرتا تھا، اس لیے وہ بیرنوں یا بیرنوں کے لگان داروں سے زیادہ بادشاہ کی اطاعت کرتے تھے۔ اس طرح یہ نئی فوجیں لڑائی میں

بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھیں اور یہ نا تربیت یافتہ اور غیر آراستہ جاگیری صف آرائی سے کبھی ممکن نہ تھا۔ چناں چہ بادشاہوں کی قوت بڑھتی رہی اور بیرنوں کی قوت گھٹتی گئی۔ یہ تمام عمل ایک ایسی ہی تحریک کی محض نقل تھی، جو ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں پہلے آریا حملہ آوروں کے قیام پذیر ہونے کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی۔ اور جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

اس کے بعد طریقۂ جنگ اور آلاتِ حرب کے استعمال میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح لمبارڈ لیگ کی فوجوں نے لگ نانو کے میدان میں فریڈرک باربروسہ کو شکست فاش دی اور کس طرح فلیمی شہروں کے باشندوں نے فرانس کے بادشاہ کی جاگیری فوج کو کورٹ رائی کے مقام پر کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس آخر الذکر لڑائی کے بعد ہی سوئزرلینڈ کے جفاکش پہاڑیوں نے آسٹروی ہیپسبرگ خاندان کے جاگیری لارڈوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ چناں چہ ہیپسبرگ خاندان کے لارڈ ایک زبردست فوج لے کر باغیوں کی سرکوبی کے لیے پہاڑوں میں پہنچے۔ مارٹ گارٹن (۱۳۱۵ء) کے مقام پر "سوئزرلینڈ کے باشندوں نے اچانک ایک نعرہ لگایا" اور گنجان صفوں پر کثرت سے چٹانیں اور پتھر لڑھکانے شروع کیے .... سنگین کلہاڑیوں سے انھوں نے دشمن کی زرہوں کو پارہ پارہ کر دیا اور لمبی برچھیوں سے ضربات لگانے اور انھیں سینوں میں پیوست کرنے لگے۔ ہلکی سی کہر نے سڑک کو خراب کر دیا تھا، اس لیے گھوڑوں کی نقل و حرکت میں دشواری پیدا ہو گئی۔ بہت سے گھوڑے جھیل میں کود پڑے اور بقیہ تمام بھڑک اٹھے۔ آخر کار پوری سوار فوج کے قدم اکھڑ گئے اور وہ یک بیک عقبی پیدل فوج پر آ پڑی۔ ملک کی طبعی حالت اس بات کی اجازت نہیں

دیتی تھی کہ پیدل فوج کی صفیں کھول دی جاتیں اور انھیں پھیلا دیا جاتا چناں چہ اس پیدل فوج پر سے بھڑکے ہوئے گھوڑوں کا یہ دستہ گزر گیا، جس سے آدمی روندے اور مارے گئے''۔[1]

یہ فیصلہ کن فتح جسے شہریوں نے نہیں بلکہ کسانوں نے اپنے قدیم ظالم جاگیری رئیسوں کے مقابلے میں حاصل تھی، بہت ہی زیادہ اہم ہے۔ اس نے نہ صرف یورپ میں دور دور تک جاگیری مظالم کی عمارت ہلا دی، بلکہ اس نے ایک کسان ریاست کے لیے حقیقی آزادی کے جنم لینے کی داغ بیل ڈال دی۔ چناں چہ ہیپسبرگ سوئز کسانوں کی لیگ کو پھر فتح کرنے میں کبھی کام یاب نہ ہو سکے۔ مارٹ گارٹن کی لڑائی کے ستر سال بعد ۱۳۸۶ء میں سمپاخ کے مقام پر ایک دوسری یادگار لڑائی میں ان کی آزادی کو پامال کرنے کی ایک زبردست کوشش کو سوئزستانیوں نے شکست دے دی۔ اس لڑائی میں دلنکل ریاسٹر کے بہادر آرنالڈ نے اپنے سینے پر سینکڑوں برچھیوں کے زخم کھاکر سوئزستانی نیزہ برداروں کے لیے جاگیری صفوں کے اندر راستہ پیدا کر دیا تھا۔

تیر اندازی

اس دوران میں نیزے سے بھی کہیں زیادہ موثر ہتھیار یعنی تیر و کمان ایجاد ہوا۔ اس کے ذریعے ایک زبردست اور پوری طرح تربیت یافتہ کسان فوج اپنی حسب مرضی مناسب دوری سے جاگیری سوار فوج کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ماہر تیر انداز شاہ بلوط کے چار انچ دبیز دروازے میں سوراخ کر سکتا ہے اور اس کے تیر چار سو گز تک جا سکتے ہیں۔ یہ بات بہت جلد واضح ہو گئی کہ ایسے خطرناک ہتھیا کے آگے جاگیری طریقۂ جنگ بالکل ہیچ ہیں۔ کریسی کی جنگ (۱۳۴۶ء) کو

---

[1] منقول از ''فرزلی یورپ'' مصنفہ ہنڈرسن

بڑی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اس میں فرانس کی شان دار جاگیری فوج، اس سے تعداد میں کہیں کم انگریز کسانوں کے مقابلے میں، جو تیر و کمان سے مسلح تھے، تقریباً بالکل بے بس ثابت ہوئی۔ کریسی کی لڑائی کے چھ سال بعد پائیٹرس کی جنگ (۱۳۵۶ء) نے بھی یہی سبق دیا۔ اس لڑائی میں جاگیری امیروں اور انگریز تیر انداز کسانوں کے درمیان ایک خوف ناک خوں ریزی کے بعد انگریزوں نے خود شاہ فرانس اور اس کے بہت سے بیرونوں کو قید کرلیا۔ اس کے بعد اگن کورٹ کے مقام پر ۱۴۱۵ء میں فرانس کی تیس ہزار طاقت ور جاگیری فوج نے پانچ ہزار انگریزوں کے مقابلے میں اس سے بھی زیادہ تباہ کن اور شرم ناک ہزیمت اٹھائی۔ اس روز خوب بارش ہو رہی تھی اور زمین نرم ہوگئی تھی۔ وزنی ہتھیار اور زرہ بکتر پہنے ہوئے نائیٹ کیچڑ میں بُری طرح پھنس گئے۔ ان پر تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ بہت سے مارے گئے۔ ان کے سروں پہ خوب مار پڑی اور یہ گرفتار کرلیے گئے۔ آٹھ ہزار سے زیادہ فرانیسی مارے گئے، اور پندرہ سو نائیٹ اور امیر قید کرلیے گئے۔

اب یورپ پر یہ اچھی طرح واضح ہوگیا تھا کہ میدانِ جنگ میں جاگیری امیر کسانوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے، جن سے وہ نفرت کرتے اور ان کی جائیدادیں لوٹا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جنگوں میں بارود کے استعمال اور آتشیں آلات سے مسلح تربیت یافتہ فوجوں کی ترقی نے یہ سبق اور بھی زیادہ قطعیت کے ساتھ ذہن نشین کردیا۔ جب مغرور بیرنوں اور نامور نائٹوں کو جو اپنی بڑی بڑی زمین داریوں کے بالکل مطلق العنان حاکم اور ایک درجن نسلوں سے اشرافی مراعات کے وارث ہوتے تھے، انھیں ادنا سے ادنا زرعی غلام دغا اور فریب سے بہت دور سے تیر یا بندوق کا نشانہ بنانے لگا

تو قدیم جاگیری اقتدار بُری طرح فنا ہونے لگا۔

انگلستان میں اشرافیہ نے روز کی جنگوں میں جو پندرھویں صدی کے نصف آخر تک جاری رہیں، خود اپنے پیر پر آپ ہی کلہاڑی مار لی۔ ان جنگوں میں بہت سے امیر مارے گئے، اور جو بچ رہے وہ اتنے مفلس اور کم زور ہو گئے تھے کہ مشہور ٹیوڈر خاندان کے ماتحت بغیر کسی دقّت کے ایک طاقت ور قومی بادشاہت قائم ہو گئی۔

فرانس میں سولھویں صدی کے دوران میں مذہبی جنگوں نے بھی یہی اثر دکھایا۔ لیکن اس مُلک میں اشرافیہ کو انگلستان کی بہ نسبت کسانوں پر بہت زیادہ اقتدار حاصل رہا۔

بادشاہت حقیقی جاگیری نظام کے بادشاہ کو اپنے خانہ بدوش قبیلے کے پیش رووں کی طرح امیر ہی منتخب کرتے، اسے مشورہ دیتے اور بڑی حد تک اس پر نگرانی رکھتے تھے۔ نقلِ وطن اور حملوں کے عہد کے یہ امیر بڑے بڑے خاندانوں کے سردار اور بادشاہ کے مصاحب ہوتے تھے۔ قبیلے جب اپنے مفتوحہ مُلکوں میں آباد ہو گئے تو ان امیروں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔

ایسے مُلکوں میں جہاں ان بڑے امیروں کی جاگیریں مفتوحہ مُلک میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر پھیلی ہوئی تھیں، وہاں کسی بیرن کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بادشاہ کے مقابلے میں خود مختار حاکم بن بیٹھتا۔ ایسی صورت بہت بڑی حد تک انگلستان میں پیش آئی۔

اس کے بعد تنخواہ یاب فوجوں کی ترقی اور امیروں کے خلاف عوام کے ساتھ بادشاہ کے اتحاد نے بادشاہت کو بہت زیادہ طاقت ور بنا دیا۔

عام رعایا کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ " اچھی حکومت دراصل ایک طاقت ور اور عوام کی حامی بادشاہت کا دوسرا نام ہے"۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ بادشاہ ان کا دوست ہے اور موروثی امیرا اپنے ظالمانہ جاگیری حقوق کے ساتھ ان کے دشمن ہیں۔ طاقت ور بادشاہ نہ صرف بیرنوں کی زیادتیوں اور ظالمانہ خود غرضیوں کا انسداد کرتا تھا بلکہ وہ جاگیری عدالتوں کے من مانے اور بے اصول قانون کی جگہ ایک بااصول قانون اور عدل کا طریقہ عائد کرتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال اور انتظام خود اس کے مقرر کیے ہوئے عہدہ دار اور دورہ کرنے والے منصف کیا کرتے تھے۔ ایسے منصف انگلستان میں " شریف " کہلاتے تھے " بادشاہ کا وجود انصاف کرنے کے لیے اور اپنی رعایا کے ہر شخص کی حفاظت، اور شخصیتوں کا لحاظ کیے بغیر قانون استعمال کرنے کے لیے تھا "۔

قرونِ وسطیٰ کے بادشاہ نے پولس اور عدالت کے عہدے داروں کے علاوہ مالیے کا مرکزی محکمہ بھی قائم کیا۔ عدالت اور مال کے نظم و نسق کے ان ہی دو بنیادی اصولوں سے موجودہ انتظامی حکومت کا نظام وجود میں آیا ہے۔

وسطی اور مشرقی یورپ اور خصوصاً مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہوں اور پولینڈ کے بادشاہوں کے معاملے میں انتخابی بادشاہت کا اصول مستقل طور پر قائم رہا۔ اس طرح جرمنی اور اس کے آگے کے ملکوں میں مرکزی بادشاہت کا اقتدار نسبتاً کم زور اور جاگیری اشرافیہ کا اقتدار قوی تھا۔ لیکن مغرب میں بہت جلد بادشاہوں اور عوام کو معلوم ہو گیا کہ موروثی جانشینی کا اصول ناگزیر ہے۔ کیوں کہ نزاعی انتخاب کے خطرات، انتخاب کرنے والوں کے ساتھ بیرونی مداخلت، اور ایک فرماں روا کی موت اور اس کے جانشین کے انتخاب کے

درمیانی وقفے کے زمانے میں طوائف الملوکی کے موقعوں نے انتہائی طریقہ عمل کو بالکل ناکارہ کردیا تھا۔ دوسری طرف اشرافیہ کی عام خواہش تھی کہ انتخابی طریقے کو جاری رکھا جائے، یا اسے دوبارہ قائم کیا جائے، کیوں کہ اس سے بہت زیادہ اقتدار اور اعزاز خود انھی کے قبضے میں رہتا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے اختتام کے قریب بیرنوں کی سخت مخالفت کے باوجود موروثی بادشاہت عوام کے اتحاد کے ساتھ انگلستان، فرانس، اور اسپین میں ایک طاقت ور مرکزی حکومت بن گئی۔ دوسری طرف جرمنی میں تین سو نیم خود مختار جاگیری ریاستیں تھیں، جن کے حکمراں اپنے منتخب کردہ شہنشاہ کے برائے نام ماتحت تھے۔ پولینڈ میں اُمرا بالکل خود مختار تھے۔ ابھی تک اطالیہ بہت بُری طرح منقسم اور زیادہ تر بیرونی رئیسوں کے زیرِ اقتدار تھا۔

پارلیمنٹ

ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ طاقت ور بادشاہت کی ترقی ہر جگہ یکساں طور پر جاری تھی۔ خود مغربی یورپ کے ملکوں میں بھی یہ بات نہ تھی۔ ایسے بھی دور آئے جب کہ اشرافیہ بادشاہ کی کم زوری سے فائدہ اٹھاکر، یا موروثی جانشینی میں رخنہ پاکر، وقتی طور پر پوری طرح غالب ہو جاتے تھے۔ لیکن اشرافی امیر ہمیشہ آپس میں لڑ پڑتے تھے اور اس طرح شہریوں اور عوام کی مدد سے بادشاہت اپنا مرتبہ اور اقتدار واپس لے لینے میں ہمیشہ کام یاب رہتی تھی۔ بادشاہت اور اشرافیہ کے درمیان اس کش مکش کا ایک نہایت اہم سبب پارلیمنٹ کا عروج تھا۔ یہ مجالس ابتدائی آریا قبیلے کے اجتماعات سے براہِ راست تعلق رکھتی تھیں۔ ان اصطلاحات کی زبان میں، جو انگلستان میں استعمال ہونے لگیں، ایک طرف "دارالامرا" تھا۔ یہ "کونسل آف ریلڈرس" کے مماثل تھا جو بادشاہ کو مشورہ دیا کرتی تھی۔

دوسری طرف" دارالعوام" تھا۔ اور یہ تمام لوگوں کی مجلس ہوتی تھی۔ ان لوگوں کو بادشاہ اور لارڈوں کسی ایسے مسئلے کے تصفیے کے لیے طلب کرتے تھے جو پوری جماعت کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ جاگیری نظام کے زمانے میں صدیوں تک عام مجلس ہنگامی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انگلستان میں ارل سائمن ڈی مان فورڈ اور شاہ ایڈورڈ اوّل نے رُوپیہ فراہم کرنے کے لیے اس اصول میں ترمیم کی تھی۔ فرانس میں" ستیری اسٹیٹ" (فرانسیسی میں "عوام" کا دوسرا نام) کو شاہ فلپ ہفتم نے ۱۳۰۲ء میں پاپائی نظام کے خلاف امداد حاصل کرنے کے لیے طلب کیا تھا۔

انگلستان میں بادشاہوں کی قابلیت نے پارلیمنٹ کی ترقی اور اقتدار کے لیے زمین تیار کر دی تھی۔ بادشاہوں نے یہ قابلیت چھوٹے زمین داروں اور بڑے بڑے شہریوں کو عدلیہ اور مالیہ کے نظم و نسق میں حصّہ دے کر انھیں مسخر کر لینے میں دکھائی تھی۔ یہ لوگ جیوری، تشخیص کنندہ محاصل اور اعزازی مجسٹریٹ کی حیثیت سے حکومت کے بہت سے کام یا تو سیکھ چکے تھے، یا سیکھ رہے تھے، اور بیرنوں یا شاہی عہدے داروں کی بداعمالیوں پر گرفت کرنے یا انھیں ٹھیک کرنے میں بہت چُست ہو گئے تھے۔ چناں چہ رفتہ رفتہ جب پارلیمنٹ باقاعدہ طور پر وجود میں آئی، اس وقت تک حکومت کے کاموں میں تجربے کار متوسط طبقہ ترقی پانے لگا۔ مختلف ملکوں کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ پارلیمانی اداروں کی کامیابی کا زیادہ انحصار ایسے ہی متوسط طبقے کے وجود پر ہے۔ اس طبقے کے بغیر یہ ادارے یا تو صاحب دولت و نسب عدیدیہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں یا عوام کی دہشت انگیزی کی صورت میں ترقی پاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہی فوجی خود مختاری کے

دور دورے کا امکان ہو جاتا ہے۔

فرانس میں امیروں کی جماعت انگلستان کی بہ نسبت بہت زیادہ قوی تھی۔ یہاں بادشاہت نے اپنے بعض وظائف حکومت کو نیابتاً انجام دینے کی اس قدر کامیابی کے ساتھ کوشش نہیں کی تھی۔ اس لیے قوم پر محصول عائد کرنے کے قابل مجلس مرتب کرنے کی کوشش خصوصاً اس لیے ناکام رہی کہ اس کام میں مدد دینے کے لیے کوئی روشن خیال اور تجربے کار متوسط طبقہ مہیا نہ ہو سکتا تھا۔ تاہم فرانسیسی بادشاہت اور عوام کے درمیان اتحاد (یہ اتحاد ہسٹری اسٹیٹ کہلاتا تھا) نے چھوٹے زمین داروں اور دیہی مجلسوں کی اپنے جاگیری سرداروں کے خلاف بغاوت میں اکثر شاہی امداد کی صورت اختیار کی تھی۔ یہی اتحاد مغرور اشرافیہ کی قوت کو کم زور کرنے میں کافی طور پر موثر ثابت ہوا۔

ایسی مجلسیں، جو تمام قوم پر محصول عائد کرنے کی اہل تسلیم کی جاتیں، ان کو مرتب کرنے اور ایسی مجلسوں کی مدد سے بیرنوں کی قوت توڑنے کی جو کوششیں بادشاہوں نے کیں، ان میں کامیابی کا انحصار نہ صرف اوسط طبقے کے عروج پر تھا بلکہ طلب کردہ مجلسوں کی نمایندگی کی قابلیت پر بھی تھا۔ آخر کار ہر شہری کو حکومتی مجلس میں نشست دینے کی غلطی سے بچنے کا ایک طریقہ دریافت کر لیا گیا۔ اسی غلطی نے تمام قدیم جمہوریتوں کو مقید کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قدیم دنیا میں ایسی "بہ راہ راست جمہوریت" کے معنی کاہل اور مفلس عوام کے ذریعے حکومت کے لیے جانے لگے تھے۔ اور یہ بات خود جمہوریت کے لیے سمِ قاتل تھی۔ لیکن انگلستان میں رفتہ رفتہ ایک دوسرا طریقہ رائج ہو گیا۔ نمایندگی کا یہ نظام جس پر پارلیمنٹ کا

دار و مدار تھا، قانونی عدالتوں، محاصل کے تعین، اور خانقاہ کی تحریکوں سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوا۔ ہر گانو یا ہر شہر اپنے نمایندے دیہی عدالت میں بھیجتا تھا اور ایڈورڈ اوّل کے عہدِ حکومت (۱۲۷۲ء تا ۱۳۰۷ء) سے دیہی عدالت پارلیمنٹ میں اپنے نمایندے بھیجتی تھی۔ اس کے بعد قصبے اور شہروں کے نمایندے مل کر "دارالعوام" بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ امیروں کی موجودگی کے بغیر جو انھیں خوف زدہ کر سکتے تھے، مباحث میں حصّہ لینے اور خود رائے دینے لگے۔

نمایندگی کے اس طریقے سے براہِ راست جمہوریت کی بُرائیاں دُور ہوگئیں۔ پارلیمنٹ کی حکومت عوام کی ایک بڑی اور ہنگامہ پرور مجلس تھی اور نہ اس کے تلوّن، اس کے کینہ محرکات و جذبات اور اس کی نفاق پسند روح کی حکومت تھی۔ تاہم حکومت اب بھی جمہوری اور مقبول ہوسکتی تھی کیوں کہ پارلیمنٹ میں بیٹھنے والے اور ملک پر محصول عائد کرنے کے طریقے متعین کرنے والے اور جدید قوانین وضع کرنے والے لوگ عوام کے منتخبہ نمایندے ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں منتخب کیا تھا، ان کے آگے یہ جواب دہ تھے۔ یہ لوگ اس قابل تھے کہ اپنے منتخب کرنے والوں کی طرف سے گفتگو کریں اور وطن واپس ہونے پر ان کو حکومت کی مرضی سے مطلع کریں۔

پارلیمنٹ کے اقتدار کا عروج

پہلے پہل پارلیمنٹ کا رکن ہونا، اور کچھ نہیں تو ایک اعزاز اور امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ کا یہ مطالبہ کہ ہر شہر یا ہر ضلع سے نمایندے مقرر کیے جائیں، بالکل ناپسند کیا گیا۔ سمجھا یہ جاتا کہ رعایا کو دیے ہوئے اس حکم

کا منشا یہ ہو کہ شاہی محصلوں کے ہاتھوں اپنی تباہی میں آپ مددد یں۔ مگر عوام کو اس حقیقت کے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ جو گویے کو معاوضہ دیتا ہو، اس کو گانا سننے کا حق حاصل ہو۔ انھوں نے اس رقم پر جو وہ بادشاہ کو ادا کیا کرتے تھے، اس کو صرف کرنے کے طریقے پر اپنی وسعت کے ساتھ بڑھتی ہوئی نگرانی کا کامیابی کے ساتھ دعوا کیا۔ دارالامرا یعنی بیرنوں کی قدیم جاگیری کونسل نے ۱۲۱۵ء میں اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ اس نے بادشاہ جان کو مجبور کر کے اس سے ایک اہم منشور حاصل کر لیا۔ اس منشور میں دارالامرا کے مفاد کے مطابق وسیع مراعات دیے گئے تھے۔ ان مراعات کو دارالامرا نے جان جیسے کم زور بادشاہ اور اس کے بعد کے کم زور تر جانشینوں کے عہد میں ناجائز طور پر استعمال کیا۔ لیکن اسی منشور کو بعد میں خود عوام نے انگریزوں کی کامل آزادی کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ تاہم دارالامرا نے اپنے مرتبے اور اپنی جاگیری عظمت کے باوجود پہلے عوام کو اپنا معاون اور پھر مخالف پایا۔ آخر کار عوام نے کچھ ایسی چال چلی کہ وہی خود حکومت کے حقیقی آلۂ کار بن گئے۔ اس معاملے میں بھی اور باتوں کی طرح عوام محصول اندازی پر تصرف کے سب سے بڑے حربے پر بھروسا رکھتے تھے۔

چودھویں صدی کے وسط میں ان گراں خرچ جنگوں کی وجہ سے جو شاہِ انگلستان فرانس سے ساتھ کر رہا تھا، انگلستان کا بادشاہ ہر سال پارلیمنٹ طلب کرنے پر مجبور ہو گیا۔ شاہِ انگلستان پالیسی سے متعلق اہم ترین مسئلوں میں پارلیمنٹ سے مشورہ لینا اور حکومت کے مختلف محکموں سے اس کی شکایتوں کے انسداد کی درخواستوں کو عموماً منظور کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ اس طرح جرأت پاکر عوام نے ۱۳۷۶ء میں فرانسیسی جنگ سے متعلق بدانتظامیوں

پر اعتراض کر دیا، اور (دارالامرا میں حکومت کے دغاباز ٹھہرنے کے باوجود) خود شاہی وزیروں کو اس کا ملزم ٹھیرایا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد عوام کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ شاہی حسابات کی تنقیح کریں کہ آیا وہ رقم جو انھوں نے منظور کی تھی، وہ ٹھیک طور پر ان ہی اغراض و مقاصد پر صرف ہو رہی ہے جس کے لیے انھوں نے رائے دی تھی۔ پندرھویں صدی کے ابتدا میں پارلیمنٹ اتنی طاقت ور ہوگئی تھی کہ اس نے ایک بادشاہ کو معزول کر کے ایک دوسرے شخص کے سر پر تاج شاہی رکھا۔

روز غاندان کی جنگوں کی طوائف الملوکی کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کی قوت بھی گھٹنے لگی اور ان کے اختتام پر انگلستان کی ایک ہی خواہش تھی کہ ایک مستحکم مرکزی حکومت قائم کی جائے۔ اس کے متعلق لوگ محسوس کرتے تھے کہ یہ کام صرف ایک طاقت ور بادشاہت ہی انجام دے سکتی ہے اور جاگیری بدنظمی کے پھر از سر نو اجرا کے خلاف یہی ایک محافظ ہے۔ اس طرح سولھویں صدی میں پارلیمنٹ اس زبردست ٹیوڈر خاندان کی مطیع اور فرماں بردار بنی رہی جس کے بہت سے طریقے بالکل استبدادی تھے۔ لیکن لوگوں کو وہ وعدے یاد تھے جو پارلیمنٹ نے ایک دفعہ کیے تھے۔ سترھویں صدی میں جب اسٹوارٹ خاندان کے عہد میں بادشاہت کو زوال ہونے لگا تو پارلیمنٹ طلب کی گئی، تاکہ عام حقوق کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ اس وقت عوام آزادی کے سورماؤں کی حیثیت سے پھر ایک بار اپنی قدیم جگہ حاصل کر لینے کے لیے تیار تھے۔

اس طرح ہم پارلیمنٹ کی ترقی کے ساتھ ساتھ آزادی اور نظم و تربیت کی روح کو ترقی کرتے دیکھتے ہیں۔ یہ روح جاگیری بدنظمی کے خلاف مرکزی

اقتدار کے لیے تاج کی کش مکش میں تاج کی مدد کرتی ہے۔ اور یہی چیز امیروں کی قوت توڑنے میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ اگرچہ یہ بات کسی اور جگہ نہیں ہوئی لیکن انگلستان میں قرونِ وسطیٰ کی پارلیمنٹ بہت بڑی حد تک خود تاج پر سیادت قائم کر لینے میں کامیاب ہوتی ہے، اور اس طرح عام آزادی برقرار رکھنے کا ایک قابلِ قدر ذریعہ بن جاتی ہے" پارلیمنٹ کے قائم ہونے سے دو صدی پیشتر اس نے پانچ بادشاہوں کو معزول کیا اور تین نئے خاندانوں کو باضابطہ خطاب عطا کیے۔ اس نے وہ راہیں دکھائی ہیں جن پر عمل کر کے خانہ جنگی کے بغیر استبدادیت سے مقابلہ کیا جا سکتا اور اسے برباد کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ دستور میں نمایندگی کا عنصر بادشاہت اور اشرافیہ دونوں کو مغلوب کر سکتا ہے" [15]

خلاصہ قرونِ وسطیٰ کی ابتدا میں یورپ خانہ بدوش وحشی قبیلوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ قبیلے وہ تھے جو چین کے دباؤ سے مغربی جانب ڈھکیل دیے گئے تھے۔ کلیسا نے پاپائی رہنمائی میں ان وحشیوں کو رام کرنے میں بڑی محنت اٹھائی۔ انھیں مسیحی اخلاقیات کے مبادیات کی تعلیم دی۔ ان کے دل پر باقاعدہ عالمی حکومت کی عظمت کا سکہ بٹھایا۔ اسی نے ظلمت کے طویل زمانوں میں زمانۂ قدیم کی عظمت اور آزادی کی یادداشتوں کو محفوظ رکھا اور جامعات کی بنیاد ڈالی، جن میں آخر کار یہی یادداشتیں پڑھی جانے والی تھیں۔

فاتح وحشیوں نے ایک نیا سادہ اور آسان سماجی اور سیاسی نظام تیار کیا تھا۔ اس میں تصور یہ تھا کہ ہر شخص کو خدمت اور فرائض انجام دینے چاہییں،

---

[15] "قرونِ وسطیٰ میں یورپ" صفحہ ۱۸۰، از ڈے وی سن۔

لیکن اس نظام میں اتنی گنجایش تھی کہ وہ خود غرض اور حریص اشرافیہ کے ہاتھوں اس کی بے لگام اور بے قانون دست اندازیوں کا شکار ہو جائے۔ چناں چہ غریبوں پر مظالم ڈھائے گئے اور سماج اور ریاست کا شیرازہ بُری طرح بکھر گیا۔

ایک ایسے معرکے میں جو شروع سے آخر تک ایک ہزار سال سے زیادہ طویل مدت تک جاری رہا، اس جاگیری نظام سے جنگ جاری رہی، اور آخر کار مختلف قسم کی قوتوں کی مدد سے اسے زیر کر لیا گیا۔ ان قوتوں میں اگرچہ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ موثر قوتوں میں نہ سہی، تاہم مقدس رومی سلطنت بھی ایک قوت تھی۔ یہ رومیوں کی عالمی سلطنت کو پھر سے دنیا میں قائم کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ دوسری قوت پاپائی نظام تھا، اس کے چند زبردست پاپاؤں کو عارضی غلبہ حاصل ہونے کے باوجود یہ نظام سب کو متحد کر دینے کی کوشش میں ناکام رہا۔ کیوں کہ پاپائی نظام کو معلوم ہو گیا تھا کہ قومی احساس کی بڑھتی ہوئی قوت خود اس کی مخالفت تھی، اور بادشاہ و عوام رومی بشپ کے خود مختارانہ دعاوی کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔ امیروں کی سیادت کو مغلوب کرنے میں ایک بہت ہی طاقت ور قوت قصبوں کا عروج تھا۔ اس عروج کا دار مدار تجارتی دولت پر تھا اور خود امیروں نے شہریوں کے ہاتھ ان کے جاگیری حقوق فروخت کر کے غیر شعوری طور پر ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ اس کے علاوہ شہری اور کسان اپنے نیزوں اور تیر کمان سے مسلح ہو کر رفتہ رفتہ جاگیری امیروں کو خود ان کے آبائی پیشہ یعنی جنگ میں شکست دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ آخر کار طاقت ور بادشاہتوں کے عروج اور عوام کی نمایندہ مجلسوں سے

ان کے اتحاد نے اشرافیہ کی سیادت کا خاتمہ کر دیا۔ اشرافیہ خوں ریز خانہ جنگیوں سے خود اپنی تباہی کے آپ ہی باعث ہوئے۔

اس طرح قرونِ وسطیٰ جنگ و جدل کا عہد ہے۔ اس عہد میں بادشاہوں اور عوام نے رفتہ رفتہ جاگیری نظام کا خاتمہ کر دیا۔

ساتواں باب

قومیت

جب ہم گزشتہ ساڑھے چار سو سال کی مدت پر نظر ڈالتے ہیں جو عام طور پر یورپی تاریخ کے عہدِ جدید کے نشو و نما کا زمانہ سمجھا جاتا ہے تو ہم انہی قوتوں کو مصروفِ عمل دیکھتے ہیں جو قرونِ وسطیٰ میں جاگیری نظام سے کش مکش میں پیش پیش تھیں۔ لیکن ان قوتوں کا اثر ایک نئی اور زیادہ طاقت ور ہمہ گیر قوت کے آگے دب گیا، جس کی ابتدا ہم یہودیوں میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ قوت جو روز افزوں اثر کے ساتھ قرونِ وسطیٰ کے آخری دور میں ترقی پذیر تھی، قومیت ہے۔ قرونِ وسطیٰ کا زمانہ اگر جاگیری معرکوں اور تہذیب اور جاگیری نظام کی آویزش کا زمانہ عروج تھا، تو عہدِ جدید قومی معرکوں اور تہذیب اور قومیت کی معرکہ آرائی کا دور ہے۔

قومیت کا عروج

قومی مجالس کے ساتھ اتحاد سے شاہی اقتدار کے استحکام کا اجمالی ذکر ہم کر چکے ہیں۔ یہ استحکام نہ صرف

انگلستان اور فرانس میں حاصل ہوا بلکہ اسپین میں بھی یہی بات ہوئی۔ اس استحکام کو لڑائیوں کے سلسلے نے قومی احساس پیدا کرکے ممکن بنا دیا۔ یہ لڑائیاں ایک طرف انگلستان اور فرانس، اور دوسری طرف اسپین اور مسلمان فاتحوں کے درمیان ہورہی تھیں۔ یہ حریف امیروں کے درمیان محض جاگیری لڑائیاں نہیں تھیں۔ عوام نے ان میں بڑی جاں بازی سے حصہ لیا، اور اس سے ان میں مشترک مفاد اور قومی حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ادھر بادشاہ زیادہ تر اس وجہ سے مقبول اور طاقت ور ہوگئے کہ وہ قومی دشمن کے مقابلے میں قومی رہنما تھے۔

غالباً یورپ میں فرانس ہی وہ پہلا ملک ہے، جہاں حقیقی قومیت نے نشوونما پایا۔ ۱۲۱۴ء میں شاہِ انگلستان، شہنشاہِ جرمنی اور فلانڈرس کے کاؤنٹ نے مل کر فرانس پر حملہ کیا اور بوئینس کی زبردست جنگ میں شاہ فلپس اور اس کی فوج سے شکستِ فاش کھائی۔ اس جنگ کو ہم سرسری طور پر فرانس کی قومیت کے آغاز کا زمانہ قرار دے سکتے ہیں۔ ٹھیک ایک سو سال بعد بنک برن کی لڑائی میں انگریزوں پر شاہ رابرٹ بروس کی فتح بھی ایک بڑا اسکاچی قومی جذبہ تھا۔ ایک طرف اس کا چتانی لڑائیوں اور دوسری طرف فرانس کے ساتھ سو سالہ جنگ میں کریسی اور پائیٹرس کی عظیم الشان فتوحات نے قومیت کے احساس کو تیز کر دیا۔ قومیت کا یہ احساس انگلستان میں پہلے ہی سے موجود تھا، اگرچہ بعد میں روز خاندان کی جنگیں اس کی ترقی میں مخل ہوئیں۔

فرانسیسی بادشاہت سو سالہ جنگ (۱۳۳۸ء - ۱۴۵۳ء) کے ابتدائی زمانے میں، بہت ہی ناکارہ ہوگئی تھی۔ جاگیری طائف الملوکی حد سے گزر چکی تھی، کسانوں پر مظالم ڈھائے جارہے تھے۔ اور ملک کے بڑے حصے کو انگریز تاخت

وتاراج کر رہے تھے۔ مگر فرانس میں قومیت کا احساس پھر عود کر آیا، اور دوشیزہ جنگ آزما "جون آف آرک" کے بہادرانہ طرزِ عمل سے فرانیسی جذبۂ حبِّ وطن شعلۂ جوّالہ بن کر اٹھا۔ اس سے فرانیسی قومیت اپنے انتہائی اعلا وارفع مرتبے کو پہنچ گئی (۱۴۲۹ء۔ ۱۴۳۱ء) جون آف آرک کے ساتھ بادشاہ نے کمینے پن سے دغا کی جس کو جون نے فرانیسی قوم کی قیادت واپس دلائی تھی۔ جون آف آرک کو ایک دہشت ناک موت مرنا پڑا لیکن وہ اپنا کام پورا کر چکی تھی۔ قومی روح موثر طور پر پیدا ہو چکی تھی اور آخرکار قومی دشمن سرزمینِ فرانس سے سر کے بل نکالا جا چکا تھا۔

موروں کے مقابلے میں اسپینوں کی طویل جنگیں پندرھویں صدی کے اختتام پر غرناطہ کی فتح تک انجام کو نہ پہنچیں۔ اس وقت سے ایک طاقت ور قومی بادشاہت نے اسپین کو پوری طرح متحد اور مستحکم کر دیا، اور ان تمام مخالفتوں کو جو خواہ امیروں، یا اسمبلیوں، یا مقامی خود مختار حکومتوں کی طرف کی گئیں، انھیں پورے طور پر دبا دیا۔ سولھویں صدی کے نصف آخر تک اہلِ اسپین فرانس اور انگلستان کی بہ نسبت ایک نہایت منظم اور طاقت ور قوم بنے رہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یکے بعد دیگرے جرمنی کے متعدد بڑے بڑے شہنشاہوں نے اطالیہ کو پوری طرح فتح کر لینے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کچھ تو اطالوی شہری ریاستوں اور کچھ پاپائی نظام کی مزاحمت، کچھ مشرقی یورپ پر ترکی اور منگولی حملوں کے نتیجے کے طور پر، اور کچھ خود جرمنی میں جاگیری نظام کی قوت کی وجہ سے ناکام رہیں۔ اطالیہ میں شہنشاہوں کی ناکامی نے دونوں ملکوں کی قومی ترقی کو بہت پیچھے ڈال دیا۔ نفاق ڈالنے والی قوتوں نے اتنا

زور پکڑا کہ ہر خطۂ زمین بیرونی لٹیرے حملہ آوروں کا میدانِ کارزار بن گیا۔ فرانس، اسپین اور اسٹریا نے اطالیہ کو تاخت و تاراج کرکے اس کے حصّے بخرے کر لیے[۱]۔ سویڈن، ڈنمارک، فرانس اور آسٹریا نے جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ ایک طاقت ور بادشاہت کے ماتحت قومی اتحاد پیدا کرنے کے لیے ان دونوں ملکوں کو انیسویں صدی تک انتظار کرنا پڑا۔

قومی مطلق العنانی تاریخ میں ایک قوت کی حیثیت سے قومیت کی ابتدا کا سراغ قرونِ وسطیٰ میں بہت دور پیچھے ہٹ کر تلاش کرنا چاہیے۔ بعض مورخوں نے اس کی ابتدا کا زمانہ اور بھی پیچھے ہٹ کر نویں اور دسویں صدی میں متعین کیا ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب کہ شاہ اجبرٹ (۸۰۲ء۔ ۸۳۹ء) کے ماتحت انگلستان ایک ملک کی صورت میں استحکام پا رہا تھا اور اس کا سلسلہ شاہ الفرڈ (۸۷۱ء۔ ۹۰۱ء) کے عہدِ حکومت تک جاری رہا۔ ادھر فرانس۔ اور جرمنی میں ہیوگا ہٹ (۹۸۷ء۔ ۹۹۶ء) اور ہنری دی فاولر (۹۱۹ء۔ ۹۳۶ء) کے ماتحت علیحدہ علیحدہ طاقت ور حکومتیں بن گئی تھیں۔ ہر مقام پر جاگیری نظام، قومی اتحاد کا ایک بدترین دشمن ثابت ہوا۔

---

۱ آسٹریا سلطنت کا ایک حصّہ تھا اور ۱۶۴۸ء کے بعد سے شہنشاہ کی قوت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہی سال تیس سالہ جنگ کے اختتام کا سنہ ہے۔ اس جنگ کے دوران میں بیرونی قوموں نے بے روک ٹوک جرمنی کو مغلوب کرکے اسے برباد کیا۔ اس کے بعد ہیپسبرگ خاندان جس کے قبضے میں شہنشاہی اقتدار تھا، جرمنی میں اور بھی کمزور ہو گیا، اس لیے یہ خاندان جرمنی سے نکال دیا گیا۔ انھوں نے اسٹریا کے اندر جہاں کے یہ موروثی حاکم تھے، اور اس کے باہر اپنی قوت کو وسعت اور استحکام دینا شروع کیا۔ اسٹریائی قوت کو فتوحات اور وسعت زیادہ تر مغربی جانب اطالیہ اور جنوب کے ان ملکوں میں حاصل ہوئی، جن پر ترک قابض تھے۔

مضبوط قومی بادشاہت کی ترقی کے راستے میں قدم قدم پر بیرن متصادم ہوتے تھے اور قومی بادشاہت ہی ایسا اتحاد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ بیرن بظاہر اس چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے جو ان کی آزادی کو برقرار رکھ سکتی تھی لیکن مغربی یورپ میں قومی خود مختاری کے سیلاب کو کسی طرح روکا نہیں جا سکا۔ سولھویں صدی کی ابتدا میں فرانس، انگلستان اور اسپین حقیقی قومیں بن چکے تھے۔ ان قوموں پر طاقت ور اور عظیم الشان بادشاہ خود مختاری کے ساتھ حکومت کر رہے تھے۔ ان کے بادشاہ صرف خود مختار ہی نہیں تھے بلکہ مقبول خود مختار حکمراں تھے کیوں کہ انھوں نے اپنی قوموں کی نام آوری، مہمات پسندی اور آزادی حاصل کرنے کی خواہش کو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اس کے بعد ہی شہنشاہ چارلس پنجم نے جاگیری بدنظمی کے خلاف ایک انتہائی زبردست کوشش کی کیوں کہ جاگیری بدنظمی نے اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

چارلس نے جرمنی میں ایک طاقت ور مرکزی حکومت قائم کرنی چاہی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس حکومت کی باگ خود اسی کے ہاتھ میں رہے اور اگر ضرورت ہو تو اس مقصد کے لیے اسپینی سپاہیوں کی امداد بھی حاصل ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ اسپین کا بھی بادشاہ تھا۔ لیکن اس کی کوششوں کا بے نتیجہ ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ جاگیری نظام، مذہبی جھگڑے اور اس کے اسپینی سپاہیوں سے نفرت، یہ سب ایسی قوتیں تھیں جن کا مقابلہ کرنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

۱۵۳۲ء میں اطالوی مصنف اور سیاست داں میکیاولی نے اپنی مشہور کتاب "رئیس" شائع کی۔ اس میں میکیاولی نے مطلق العنانی کا ایک انتہائی تصور پیش کیا۔ اس کی رو سے ریاست کے مفاد کو ایک مطلق العنان فرماں روا کی ذات میں مجسم کر دیا، جو مذہب اور اخلاق کے قوانین سے بالاتر

ہے۔ میکیاولی کے تصورات اس کے عہد کی روح کا خلاصہ ہیں۔ یہ روح وہ تھی جو متعدد وحشیوں سے سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں صدی سے گزر کر انیسویں صدی میں بھی باقی رہی۔

اس طویل عہد میں یورپ کے اکثر ملکوں میں عام مجلسیں یا تو اپنا اقتدار کھو کر ناکارہ ہو گئی تھیں، یا بادشاہ کی شخصی مرضی کے آگے جھک گئی تھیں۔ خوف ناک بین الاقوامی جنگوں کی وجہ سے برّاعظم یورپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اگرچہ مذہبی اور تجارتی اغراض بھی ان جنگوں کے وجود میں لانے کا باعث ہوئیں لیکن زیادہ تر شاہی خاندانوں کی تنازعات پر ان کی بنیاد تھی۔

قومیت کے ارتقا میں مذہب اور تجارت کا اثر

مذہب کے لحاظ سے سولھویں صدی کی ابتدا میں جب پروٹسٹنٹ اصلاح سے رومی کلیسا علیحدہ ہو گیا تو اسپین مجنونانہ طور پر کیتھولک ہی رہا۔ انگلستان معتدل طور پر پروٹسٹنٹ بن گیا۔ (پوپ کی جگہ انگلستان کا فرماں روا قومی کلیسا کا صدر ہو گیا) اور فرانس نے خوف ناک خانہ جنگیوں کے بعد معتدل طور پر کیتھولک رہنے کا فیصلہ کیا[1]۔ جرمنی کا علاقہ جنوب میں کیتھولک نظام اور شمال میں ایک طرح کے پروٹسٹنٹ نظام کے ماتحت بٹ گیا۔ ان نظاموں نے مقامی رئیس کو اس کی ریاست میں مذہبی صدر بنا دیا اور اس طرح جرمنی کے اندرونی جھگڑوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ چناں چہ مذہبی اصلاح کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرنے والی قوتوں میں مذہبی نفاق کی ایک اور قوت شامل ہو گئی۔

---

[1] لیکن یہاں بھی لوئی چہاردہم اور نپولین جیسے مطلق العنان بادشاہ، پوپ سے آزاد ہو کر جو بھی چاہتا کرتے تھے بلکہ یہ خود ہی پوپ کو ہدایت کرتے تھے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

تجارت کے لحاظ سے پندرھویں صدی کے اختتام پر امریکہ اور مشرق کو جانے والے بحری راستوں کی دریافت عظیم الشان بحری تجارت کی ترقی کا باعث ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوف ناک قومی رقابتیں پیدا ہو گئیں۔ ان رقابتوں کو حرص اور مہمات پسندی کی روح، جو اس عہد کے ملاحوں اور سوداگروں میں بہت تیز تھی، بہت کچھ تقویت دے رہی تھیں۔ پہلے پرتگالیوں اور پھر ولندیزیوں نے کوشش کی کہ مشرق کے ساتھ جدید تجارت کو اپنے ہی قبضے میں رکھیں۔ ادھر پوپ کی حمایت سے اسپینوں نے دعوا کیا کہ امریکی براعظموں اور جزیروں سے نفع اٹھانے کے وہی حق دار ہیں۔ اس میں صرف برازیل کا ملک جو مستثنیٰ تھا، پرتگالیوں کے ہاتھ آیا۔ اسپین اور انگلستان کے درمیان قومی پرخاش، جو سولھویں صدی کے آخری حصے میں بہت نمایاں رہی، زیادہ تر اسپین کے امریکی اجارے میں انگریزوں کی مداخلتوں سے پیدا ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان قوموں کو لڑانے میں مذہبی اختلافات کا بھی کافی اثر تھا۔ سترھویں صدی میں انگریز اور ولندیزی دونوں پروٹسٹنٹ قوموں کی آپس کی لڑائیاں بھی تجارتی مسائل اور تجارتی رشک وحسد ہی کی وجہ سے ہوئیں۔ ۱۷۰۱ء اور ۱۷۶۳ء کے درمیان انگلستان اور فرانس میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان سے بہت بڑی حد تک یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ تجارت میں وسعت اور دور دور کی منڈیوں کو حاصل کرنے اور انھیں اپنے قبضے میں رکھنے کی خواہش، یہ وہ اہم اسباب تھے جنھوں نے انیسویں صدی میں یورپ کی مختلف قوتوں کو نو آبادیاتی جھگڑوں اور معرکوں میں مبتلا کر دیا اور آخر کار جرمنی کی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء) تک ان کا سلسلہ جاری رہا۔

فیاض مطلق العنانی

یورپ میں مطلق العنانی کا دور دورہ اس وقت تک رہا جب تک کہ وہ قومی کارکردگی اور قومی وسعت کے لیے پوری قوم کی مرضی کا اظہار اور اس کی نمایندگی کرتی رہی۔ اسی حیثیت سے وہ حقیقی طور پر مقبول رہی۔ اس طرح فرانس کا زبردست مطلق العنان بادشاہ لوئی چہاردہم اس لیے خودمختاری کے ساتھ حکومت کرسکتا تھا کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے اپنے ملک کو عظمت اور شان وشوکت کی انتہائی بلندی تک پہنچا دیا تھا۔ اس بادشاہ نے ایک طرف فرانسیسی تمدن اور دوسری طرف فرانسیسی فوجوں کو پورے برّاعظم یورپ کے لیے نمونہ بنا دیا تھا۔ پھر نپولین بھی اس طرح انھی وجوہ کی بنا پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرسکتا تھا۔ نپولین ایک زبردست قوم کے اقتدار اور عظمت کے حصول کے جذبے کا زندہ مجسمہ تھا۔ اس کے علاوہ نپولین کی حکومت پوری طرح کارآمد اور کاروباری تھی۔ دوسرے بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کی نسبت بھی یہی درست ہے۔ مثلاً روس کا پیٹر اعظم (سنہ ۱۶۸۹ء، سنہ ۱۷۲۵ء) پروشیا کا فریڈرک اعظم (سنہ ۱۷۴۰ء، سنہ ۱۷۸۶ء) اور ان سے دوسرے درجے پر آسٹریا کا جوزف دوم (سنہ ۱۷۶۵ء، سنہ ۱۷۹۰ء) اس فہرست میں ہم غالباً انگلستان کے آلیور کرامول کا نام بھی شامل کرسکتے ہیں۔

یہ مطلق العنان بادشاہ مضبوط کردار، روشن خیال، صاحبِ عزم، متحمل اور عالی ہمت انسان تھے۔ یہ وہ آدمی تھے، جنھوں نے اپنی تمام قابلیتوں کو کارکردگی اور ترقی کے اصولوں کے مطابق اپنی قوم پر حکومت کرنے میں لگا دیا تھا۔ امیروں کی قوت کو سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ تجارت اور صنعت وحرفت کی ہمت افزائی کی گئی۔ تعلیم کے نظامات مرتب کیے گئے۔ قومی مالیات

کو احتیاط کے ساتھ منظم کیا گیا اور عہدے داروں کی بدعنوانیوں کا انسداد کیا گیا۔ نوآبادیاں بسائی گئیں۔ قوانین منضبط کیے گئے۔ رفاہِ عامہ کے بڑے بڑے کام کیے گئے۔ شہروں کی تعمیر ہوئی۔ نہریں کھودی گئیں اور دلدلوں کو پاٹ دیا گیا۔ ایسے "فیاض مطلق العنان" بادشاہوں نے نہ صرف اپنی کامیاب بیرونی جنگوں سے بلکہ ہر قسم کی داخلی دانشمندانہ قانون سازی سے اپنی اپنی قوموں کی قوت میں اضافہ کیا۔ ان کی طاقت کے انحصار کا آخری ذریعہ بڑی بڑی فوجیں تھیں، جن کو مطمئن رکھنا اور بیرونی لڑائیوں میں مصروف رکھنا پڑتا تھا۔ مجلسوں کے نمایندے بہت بڑی حد تک گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے تھے۔ بعض ملکوں میں ایسی مجلسیں عملاً مسدود کر دی گئی تھیں۔ دوسرے ملکوں میں نیم دلی کے ساتھ کوشش کی گئی کہ ان کو بھی حکومت کے کام میں کچھ حصہ دیا جائے لیکن جیسے ہی مجلس نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا، اسے فوراً توڑ دیا گیا۔ کرامول کا یہی طریقہ تھا۔

فیاض مطلق العنانی کا زمانہ ایک مسلسل جنگ و جدل کا زمانہ تھا، اس کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ ان قومی فوجوں کی فتح مندی اور نام آوری کی پیاس بجھانی تھی، بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ ایسے معرکے ان حکمرانوں کی امنگوں کو دل کھول کر پوری کرنے کا موقع دیتے تھے۔ ان امنگوں کی حمایت میں رائے عامہ کے حاصل کرنے کے یہی بہترین طریقے تھے۔ یہ امنگیں کیا تھیں؟ بادشاہوں کے انفرادی اور خاندانی معاملات تھے۔ مثلاً وراثتی جھگڑے، یا شادی بیاہ کی قرار دادیں، یا خود ان مطلق العنان بادشاہوں کی شخصی عداوت یا دوستی۔

جمہوری قومیت

لیکن یورپ کی قوموں پر دائمی طور پر ایسی حکومت نہیں کی جا سکتی تھی۔ جوں جوں تعلیم کی اشاعت

ہوئی، جیسے جیسے تجارت کو فروغ ہوا، جیسے جیسے مال و دولت میں اضافہ ہوا اور جیسے جیسے سائنس نے قدرت پر قابو پانے کے جدید ذرائع اور اس سے قوت حاصل کرنے کے تازہ خزانے دریافت کیے، ویسے ویسے آزادی کی خواہش بھی قوی سے قوی تر ہوتی گئی۔ جب تک یہ مطلق العنان بادشاہ سچے خیر اندیش اور حقیقی طور پر قابل رہے، لوگوں نے ناگواری کے ساتھ ان کی اصلاح کو قبول کیا۔ مگر جو اصلاحیں اس طرح عائد کی جائیں، وہ بہت زیادہ پس وپیش کے بعد قبول کی جاتی ہیں اور ان اصلاحوں کی بہ نسبت جو ایک قوم خود اپنے آپ پر عائد کرتی ہے، یہ قومی کردار میں حقیقی تغیرات پیدا کرنے کے بہت کم قابل ہوتی ہیں۔ یہ مطلق العنان بادشاہ اپنی اصلاح کے جوش میں نادانی اور جبر و تعدی کا سا انداز رکھتے تھے، اور قوم کے ان ہی حصوں کو غیر ضروری نقصان پہنچاتے تھے جن کو راضی رکھنا ان کے لیے نہایت ضروری تھا، اگر وہ اپنی کی ہوئی تبدیلیوں کو دائمی بنانا چاہتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فیاض مطلق العنان ہمیشہ ہمیشہ حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ مر جاتا تو موروثی جانشینی کی رو سے تخت پر دوسرا مطلق العنان بادشاہ بیٹھتا، جو نہ صرف یہ کہ فیاض نہیں ہوتا بلکہ محض استبدادی یا کم زور، نااہل اور اپنی قوم کے لیے باعثِ ننگ ہوتا تھا۔ موروثی جانشینی پولینڈ اور مقدس رومی سلطنت کے سوا اس وقت تک یورپ میں ہر جگہ رائج ہو گئی تھی۔ چناں چہ عظیم الشان لوئی چہاردہم کا جانشین، قابلِ نفریں لوئی پانزدہم ہوا۔

مختصر یہ کہ رفتہ رفتہ مطلق العنانی کی مقبولیت ختم ہو گئی۔ یہ تغیر اس لیے مہلک ثابت ہوا۔ مفکروں کے ایک عظیم الشان سلسلے نے جن میں روسو سب سے زیادہ فصیح البیان اور با اثر تھا، آزادی کے قدیم اصولوں کو استعمال

کرنے کے خیال کی طرف یورپ کو پھر متوجہ کیا۔ انگلستان کے خلاف امریکی نوآبادیوں کی بغاوت اور ممالکِ متحدہ کی جمہوریت کا قیام اس بات کا عملی ثبوت تھا کہ فی الواقعی آزادی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد ۱۷۵۹ء سے لے کر ۱۹۱۸ء کے دوران میں انقلابوں کے ایک سلسلے نے خود مختاری کا تختہ اُلٹ دیا۔ فرانس کی طرح بعض ملکوں میں یہ کئی دفعہ قائم ہوئی اور پھر اُلٹ دی گئی۔ جمہوریت نے ہر جگہ اپنے قدم جمائے اور قوم کی منتخبہ مجلسوں پر مضبوطی کے ساتھ اس کی بنیاد رکھی گئی۔

لیکن جمہوریت بھی ایسی ہی محدود قومیت تھی جیسے کہ خود مختاری شہنشاہیت کی طرف قدیم جمہوریتوں کے میلان کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ جدید یورپ میں بھی آزاد شدہ قوموں کی اس سے زیادہ اور کوئی تمنا نہیں کہ موقع ملے تو وہ دوسری قوموں پر حکومت کریں۔ انقلابی فرانس نے پہلے تو اپنے انقلاب کے آتشیں عقیدوں کو تلوار کے زور سے پھیلایا اور پھر اس کے بعد اپنی شہنشاہی عظمت کے لیے یورپ کو فتح کرنا چاہا، اس کے بعد جب ہنگری نے اسٹریا کے استبداد سے اپنی گلوخلاصی کر لی تو اس نے خود اپنی محکوم قوموں کی قومی تمناؤں کو سختی کے ساتھ دبانے کی پالیسی اختیار کی۔

حالیہ واقعات ہی کو لیجیے۔ یہ سیاسی فیصلے کے لیے بہت ہی تازہ ہیں۔ لیکن ان کے متعلق یہ دکھانے کے لیے بہت کچھ کہا گیا ہے کہ خود مختاری سے جمہوریت میں تبدیلی نے متحارب قومیت کے میلان کو روکنے میں بہت کم کامیابی حاصل کی ہے۔

قومیت کے اثرات

قومیت کے نتائج کئی طرح تباہ کن ثابت ہوئے۔ یکے بعد دیگرے مسلسل بین الاقوامی جھگڑے اُٹھ

کھڑے ہوئے، اور یہ وہ جھگڑے ہیں جو بڑے پیمانے پر مصارف اور جانی نقصان کو بڑھا رہے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ قومی جنگ اب سائنس کی ایجادوں اور اس کی بے پناہ طاقتوں سے کام لے کر تہذیب کو تباہ و برباد کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے۔ جرمن جنگ اپنے مختلف نتائج کے علاوہ دو کروڑ جانوں کی قیمت ادا کر چکی ہے اور تجارت اور صنعت و حرفت اور انسانیت کی فلاکت اور فاقہ کشی ہیں اس کے پورے پورے اثرات ابھی تک اچھی طرح محسوس نہیں کیے گئے ہیں۔

اس طرح انسانیت کے مفاد کے لیے ضروری ہے کہ پرانی طرز کی قومیت یعنی ایسی قومیت کا قائمہ ہو جائے جس کے معنی یہ ہیں کہ اقوامِ عالم انتہائی خطرناک ہتھیاروں کے ساتھ لیس منظم فوجوں کے ساتھ ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار رہیں، ان فوجوں کو ریاست کی طرف سے مالی اور جانی امداد حاصل رہے۔ ایک لمحے کی اطلاع پر معمولی سے معمولی وجوہ کی بنا پر خوں ریز معرکوں میں مصروف ہو جائیں۔ ان معرکوں کے دوران میں ریاست کے مقابلے میں فتح حاصل کرنے کے لیے جو وقتی طور پر "قومی دشمنی" سمجھی جاتی ہے، ہر چیز یہاں تک کہ ناپیدا نسلوں کی بقا کے امکانات تک قربان کر دیے جاتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح قرونِ وسطیٰ میں تہذیب نے جاگیری نظام کی روک تھام کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی طرح آج بھی اس سے بڑے پیمانے پر ضرورت ہے کہ تہذیب کی بقا کے لیے قومیت کی روک تھام کی جائے۔

صحیح طور پر قومیت کے روکنے کے مسئلے کے لیے ضرورت ہے کہ لوگوں کی وفاداری اور ایثار منش خدمت گزاری کو ایک ایسے مقصد تک وسعت دی جائے جو قوم کے خیال سے بہت دور ہے۔ "حب وطن کافی نہیں"[1] ہمیں ایک عالمی

(فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۹ پر دیکھیے)

وفاداری اور ایک عالمی خدمت گزاری کی ضرورت ہے۔ اگر لوگ اپنی قوم کے سوا آزادی اور خوشی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ خوفناک تباہی ہوگا، کیوں کہ قوموں سے قومیں دست و گریباں ہوتی رہیں گی اور جنگ میں جیسے سائنس بہت جلد اس قدر خطرناک بنا دے گی کہ لڑنے والے اور نہ لڑنے والے سب یکساں طور پر عام تباہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ایسی جنگ دوسری قوموں کو بھی جنگ میں گھسیٹتی رہے گی، یہاں تک کہ ساری دُنیا خود اپنے ہاتھوں خودکشی کرنے لگے گی کیوں کہ انسانیت آپس میں اس طرح مربوط ہے کہ کسی بڑی قوم کے لیے زیادہ دنوں تک غیر جانب دار رہنا ناممکن ہے۔ یہ بات جنگِ عظیم میں اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے۔

لیکن اگر دوسری طرف وفاداری اور آزادانہ خدمت گزاری کے جذبے کو قومی حبِّ وطن سے آگے عالمی حبِّ وطن تک وسعت دی جائے۔ اور اگر انسانی جذبۂ جنگ کو امراض، افلاس، عدمِ مساوات اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے میں لگا دیا جائے تو امید ہوتی ہے کہ دُنیا نہ صرف تباہی سے بچالی جائے گی بلکہ انسانی سلامتی، خوش حالی اور آزادی کو بھی بے پایاں اور عظیم الشان وسعت دی جا سکے گی۔

موجودہ دُنیا کا مسئلہ تاریخ کے دَورِ حاضر کے دَوران میں دُنیا کے سامنے جو مسئلہ ہے، وہ یہ ہے کہ ایک تنگ اور جارحانہ قومی حبِّ وطن کی بجائے، وسیع وفاداریوں کو اس کا بدل بنایا جائے۔ ایسی وفاداریوں کا رُخ بڑھتے ہوئے انسانی اجتماعات کی طرف ہونا چاہیے

(صفحہ ۱۶۸ کا حاشیہ) ، نرس کیول کے آخری الفاظ جو خود بھی ایک زبردست محبِّ وطن انگریز عورت تھی اور جنگِ عظیم میں قومیت کا شکار ہوئی۔

جو دُنیا کے وسیع سے وسیع رقبوں میں بستے ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہ مسئلہ نہ تو داخلی جمہوریت سے حل ہو سکتا ہے اور نہ ایسی آزادی سے جو بیرونی شہنشاہیت کے زیرِ اثر ہو۔ یقیناً تاریخ بتاتی ہے کہ جدید یورپ میں قدیم یونان کی طرح آزاد اداروں اور خود مختاری کا حصول، قوموں میں دوسری قوموں کی آزادی کو محدود کر دینے کا دلی شوق پیدا کرتا جا رہا ہے تاہم ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ ایک ایسی ریاست کی ہمسائگی جس پر ایک مطلق العنان بادشاہ یا ایک فوجی طبقہ حکمراں ہو، آزاد اور مہذب قوم کی دولت عامہ کے لیے بے ضرر کبھی نہیں ہو سکتی۔ ایسے مطلق العنان بادشاہ، یا ایسے فوجی طبقے کے لیے بیرونی جارحانہ کارروائیوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی ہوس ہوتی ہے۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ مہذب قوموں کی دولتِ عامہ میں ایسی ریاستوں کا وجود ناممکن ہوگا جو دوسری ریاستوں کے زیرِ اقتدار ہوں کیوں کہ شہنشاہی قومیت ایک طاقت ور قوم کو دوسری کمزور قوم پر غلبہ اور استحصال کی اجازت دیتی ہے، اس کا وجود خود اس بات کا ثبوت ہے کہ جارحانہ قومیت کی ابھی روک تھام نہیں کی گئی اور آزادانہ تہذیب حاصل نہیں ہوئی ہے۔

لہٰذا اس حل طلب مسئلے کو اس طرح سلجھانا چاہیے کہ جمہوری اور خود مختاری سلطنتوں کو کسی ایسے معاہدے کے ذریعے متحد کیا جائے، جو جارحانہ اور شہنشاہی قومیت کو زیادتیوں سے باز رکھے۔

قومیت کے فائدے

قومیت کے جذبے نے اپنے خطرات اور ناگواریوں کے باوجود انسانیت کو بہت سے فائدے پہنچائے ہیں۔ مثلاً موجودہ دُنیا میں حکومتِ خود اختیاری کے یونانی تصور

(یعنی ایک چھوٹی سی قوم کا حقِ خود اختیاری ہر قسم کے شہنشاہی غلبے اور استحصال کی بنیادی ناانصافی کو واپس لانے میں یہی سب سے بڑا عامل تھا) اس سے ہم بعد میں بحث کریں گے۔ قومیت نے شاعروں، خطیبوں اور مصوروں کے لیے بے شمار موضوع اور جذبات کا کبھی نہ خشک ہونے والا چشمہ مہیا کرکے ادب، اور فنونِ لطیفہ کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ اس نے تعلیم کی اشاعت اور تمام دنیا میں جدید تمدن کے مادی فوائد (مثلاً ریلوے، ٹیلی گراف اور زندگی کے اعلا معیار) کی توسیع میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی قوموں میں ایسی کارگزاریوں میں مسابقت کے لیے خوش آیند رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے بے شمار جاں بازانہ ایثار کیے ہیں۔ جن میں سیکڑوں بہادروں نے اپنی قوموں کے لیے جانیں دے دی ہیں۔ اس نے ایک ایسے طریقۂ کار کو ترقی دی جس کے ماتحت فرداً فرداً ہر شہری کی جبلتیں اور سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ مکمل طور پر مملکت کے اغراض کے تابع کر دی گئی ہیں۔

تاہم ان تمام برکات کے باوجود جنگِ عظیم نے واضح کر دیا کہ تا وقتیکہ قومی وفاداری کو وسعت نہ دی جائے اور حبِّ وطن میں پوری انسانیت کو شامل نہ کیا جائے قومیت انسانیت کو بالکل برباد کر دینے کا خطرہ اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر وہ کون قوتیں ہیں جو اس بے لگام قومیت کو روکنے اور انسانی وفاداریوں کو وسعت دینے کے لیے گزشتہ زمانے میں استعمال کی گئیں اور جو شاید مستقبل میں بھی کام آسکیں؟

قومیت کی روک تھام
(۱) توازنِ قوت

توازنِ قوت کا خیال غالباً اطالیہ میں پیدا ہوا اور وہاں سے سولھویں صدی کی ابتدا میں تمام یورپ میں پھیل گیا۔ انگریزوں کے مطلق العنان

بادشاہ ہنری ہشتم (۱۵۰۹ء تا ۱۵۴۷ء) کے طاقت ور اور اولوالعزم وزیر کارڈینل ولزی کے متعلق بہت سے مورخوں کا خیال ہے کہ اس نے انگلستان کے تعلقاتِ خارجہ کو اسی اصول پر چلایا تھا۔ اس کے زمانے میں فرانس شہنشاہ چارلس پنجم سے جو اسپین کا بھی بادشاہ تھا، اطالیہ پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے لڑ رہا تھا۔ انگلستان کو اطالیہ کے مسئلے سے کوئی براہِ راست دلچسپی نہیں تھی لیکن اتحادوں میں عیارانہ تبدیلی کے ذریعے ولزی نے ان جنگوں میں انگلستان کو ایک اہم شریک بنا دیا۔ اتحادوں میں عیارانہ تبدیلی اس طرح کی کہ پہلے تو اسپین سے اتحاد کیا پھر فرانس سے، پھر دوبارہ اسپین سے اور پھر مکرر فرانس سے اتحاد کیا۔ ولزی نے کچھ ایسی ترکیب کی کہ براعظم یورپ کے ان دونوں بڑے بڑے حکمرانوں نے اس کے آقا کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا اور اس کو اپنا مدِ مقابل سمجھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی جانب سے بھی ایسے فریق کو ناراض نہیں کیا جا سکتا تھا، جو ایک مخالف یا ایک حلیف کی حیثیت سے طاقت ور بن سکتا تھا۔ ہنری کے تلون اور ولزی کی عیارانہ حکمتِ عملی نے متحاربین میں ایک سرسری توازن قائم کر دیا۔ اور دونوں طرف سے کوئی بھی اتنا قوی نہ ہو سکا کہ وہ شاہ انگلستان اور اس کے وزیر کو نظر انداز کر سکتا۔

اس انوکھی اور ذلیل سی حکمتِ عملی کو ملکۂ الزبتھ نے خود اپنی شادی کے معاملے میں مختلف حالات کے ماتحت جاری رکھا۔ فرانس اور اسپین دونوں اپنے شاہی خاندان کے کسی رکن کے ساتھ اس انگریز ملکہ کی شادی کے متمنی تھے اور اس طرح انگلستان سے اتحاد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود مختاری کے اس عہد میں جیسے جیسے واقعات گزرتے گئے، یہ بات مناسب اور قدرتی سمجھی جانے لگی کہ پوری قوم کو اس کے فرماں روا کے کسی خاندانی معاملے

پر قربان ہو جانا، یا جنگ میں کود پڑنا چاہیے۔ الزبتھ نے اپنی شادی کے معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، اور اپنے متعدد خواستگاروں میں سے کسی کا بھی انتخاب نہیں کر سکی۔ اسی چیز نے اسپین اور فرانس دونوں کو سالہا سال تک اس کا دوست بنائے رکھا۔

آخر کار جب اسپین نے ندرلینڈ میں اپنی پروٹسٹنٹ رعایا پر بے دردی سے مظالم ڈھانے اور اپنے امریکی مقبوضات کو بے رحمی کے ساتھ لوٹنا شروع کیا تو اس کا وجود بقیہ دُنیا کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی الزبتھ نے اپنے آپ کو اس زبردست معرکے میں مبتلا کر لیا، جس کا خاتمہ اسپینی آرمیڈا کی شکست پر ہوا۔ اس طرح یورپ کی دائمی بھلائی کے لیے انگلستان نے توازنِ قوت کو ٹھیک کر دیا، کیوں کہ یہ اسپینی غلبے کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا تھا۔

سترھویں صدی کے آخر میں فرانس نے اسپین کی طرح اتنی قوت حاصل کر لی کہ اس سے دوسروں کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان اور ہالینڈ نے ولیم آف آرینج (انگلستان کا ولیم سوم) کی دوراندیشانہ اور مضبوط قیادت میں، دو زبردست لڑائیاں توازنِ قوت ٹھیک کرنے کے لیے لڑیں، کیوں کہ وہ اس وقت خطرے میں تھا۔

اٹھارھویں صدی کے دوران میں توازن کا خیال یورپی سیاست کا ایک مسلمہ اور بنیادی اصول بن گیا۔ اس زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں کی ذاتی خصوصیتوں اور الجھی ہوئی حکمت عملیوں نے توازنِ قوت کو بہت تغیر پذیر کر دیا تھا۔ چناں چہ توازن ہمیشہ خطرے میں رہتا تھا اور متعدد بڑی بڑی جنگیں اسی کا نتیجہ تھیں۔ ان جنگوں میں سات سالہ جنگ (۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء) جس

ہیں برطانیہ اور پروشیا فرانس کے خلاف متحد ہوگئے تھے، اور انقلابی اور نپولینی فرانس کی کش مکش جو ۱۷۹۲ء سے ۱۸۱۵ء تک جاری رہی، سب سے زیادہ اہم ہیں۔ پھر ایک بار انگلستان نے فرانس کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف زبردست حصہ لیا اور اس طرح آخر کار توازن قائم کر دیا۔

اس کے بعد انیسویں صدی میں یہی حکمتِ عملی جو روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف استعمال کی گئی، جنگ کریمیا کا باعث ہوئی۔

آخر کار بیسویں صدی میں جرمنی کے عزائم سب سے عظیم ترین جنگ کا باعث ہوئے۔ یہ لڑائی اس لیے لڑی گئی تھی کہ توازنِ قوت کو پھر ایک بار محفوظ اور یورپ کو جرمن قومیت کے گھمنڈ اور اس کی دست برد سے بچا لیا جائے۔

اس طرح چار سو سال سے انگلستان اور بڑی حد تک یورپ کی دوسری حکومتوں کی مستقلاً یہی پالیسی رہی ہے کہ ایسی انفرادی قوم کی مخالفت کی جائے جو ناجائز دباؤ یا جارحانہ کارروائیوں کے ذریعے سے وقتی طور پر یورپ کی دوسری قوموں کو غلام بنانے کی دھمکی دیتی ہو۔ اس ذریعے سے قومی خود غرضی کو روکنے کی ایک حد تک کوشش کی گئی۔

لیکن توازنِ قوت کا تصور ہی بجائے خود غیر مستقل اور خطرناک ہے سلطنتوں کو کمزور یا طاقتور بنانے والے ہزاروں عامل ہوتے ہیں، ایسے ہی ایک عامل کی حیثیت سے توازنِ قوت کا خیال ناکام ثابت ہو چکا ہے خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں میں بے شمار سازشیں جھگڑے اور رشک و حسد یہ سب باتیں موجود تھیں، یہ خیال عرصۂ دراز تک کمزور سا توازن برقرار رکھنے اور کسی ایک ریاست کو ناجائز غلبہ حاصل کرنے

سے روکنے میں بالکل ناکام رہا۔ دولت کی فراوانی اور سائنس کی ایجادات، یا اتحاد اور حکومت کی کارکردگی، خود مختاری، یا جمہوریت کے لیے دستور میں تبدیلی (یہ دونوں جارحانہ ہو سکتے تھے) ہمسایہ ریاستوں کے حالات یا طرزِ حکومت میں تغیر اور ایسی ہی تمام دوسری قوتوں نے ثابت کر دیا کہ وہ کسی وقت بھی ایک قوم کو ناجائز غلبہ دلانے کے لیے توازن کو درہم برہم کر سکتی اور یورپ کو جنگ میں گھسیٹ لے سکتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی توازن کی حکمتِ عملی کا مطالبہ ہے کہ ایسی متوقعہ جنگ کی تیاری کے لیے اتحادوں میں مسلسل کانٹ چھانٹ اور ردّ و بدل کیا جائے۔ ایسے اتحاد قائم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اتحاد کا ہر رکن اپنے اتحادیوں سے کیے ہوئے معاہدے کی رُو سے مجبور ہے کہ اپنی فوجی اور بحری قوتوں کو انتہائی ممکنہ حد تک ترقی دے۔ اس طرح برِّاعظم یورپ کی قوموں نے منظّم اور وسیع لشکرگاہوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ قومیں مستحکم قلعہ بند سرحدوں پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہیں۔ سال بہ سال یہ جبراً بھرتی شدہ زبردست فوجوں اور انتہائی سائنٹفک اور گراں خرچ بحریوں کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے زیادہ سے زیادہ آدمی اور زیادہ سے زیادہ روپے لگانے پر مجبور ہوتی جا رہی ہیں۔

اس طرح توازن کی حکمتِ عملی نے بعض وقت بے لگام قومیت کی بُرائیوں کو روکنے کی بجائے انھیں اور تقویت دی ہے۔ غرض اس حکمتِ عملی کے متعلق سب سے اچھی بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ صحیح توازن کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اسے دوبارہ قائم کرنے کا یہ ایک بھدّا، ناکارہ، گراں خرچ اور خونی طریقہ ہے۔

(۲) اتحادات توازن کی حکمتِ عملی کو برقرار رکھنے کی کوشش میں نتیجتہً جو بڑے بڑے اتحادات مختلف وقتوں میں ہوئے، وہ اس لائق ہیں کہ ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے۔ سترھویں صدی کے آخری زمانے

میں ایسے اتحادات مسلسل ہو رہے تھے اور ان کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان اتحادوں میں خاص طور پر ولیم آف آرنج نے انتھک کوشش کے ساتھ حصہ لیا تاکہ فرانس کے لوئی چہار دہم کے عزائم کی روک تھام کی جا سکے۔ ان اتحادوں کو قائم رکھنے میں ولیم کو بے انتہا مشکل پیش آئی، تاہم اس کے مرنے کے بعد اسپینی وراثت کے لیے جو زبردست جنگ ہوئی (۱۷۰۱ء سے ۱۷۱۳ء) اس میں ولیم کی حکمتِ عملی نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس جنگ میں انگلستان، ہالینڈ اور آسٹریا لوئی کی جارحانہ کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو گئے تھے لیکن یہاں بھی انگلستان کے مشہور سیاس و سپہ سالار مارل برو کو اپنے حلیفوں کے اتحاد کو برقرار رکھنے میں انتہائی دشواری پیش آئی۔

اٹھارھویں صدی کے دوران میں پروشیا کے خلاف اتحادات قائم کیے گئے کیوں کہ پروشیا فریڈرک اعظم کے ماتحت جارحانہ میلانات کو ترقی دے رہا تھا۔ اس صدی کے اختتام پر زبردست انگریز مدبر ولیم پٹ خاص طور پر ان اتحادوں کا ذمے دار رہا جو فرانسیسی جمہوریہ اور نپولین سے لڑائیوں کے باعث ہوئے۔ نپولین کے فرانس کی آخری شکست کے بعد آسٹریا اور روس کے شہنشاہوں اور پروشیا کے درمیان ایک اتحاد قائم کیا گیا۔ اور اس میں فرانس کا بحال شدہ بادشاہ اور دوسرے حکمراں بھی شریک کیے گئے۔ بہ ظاہر اس اتحاد کا مقصد یورپ میں امن قائم کرنا تھا، لیکن اس کا اصل مقصد جمہوریت کو مضمحل اور خود مختاری کے تحفظ کے ساتھ ساتھ بر خود غلط قوموں اور ان کے حکمرانوں کی جارحانہ کارروائیوں کی روک تھام کرنا تھا۔ چناں چہ آزادانہ خیالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اس کی قوت میں بھی زوال آنے لگا۔

آخر میں حالیہ جنگ عظیم میں دُنیا کی تمام بڑی اور بہت سی چھوٹی قومیں

غلبۂ عالم کے لیے جرمنی اور اس کے اتحادی آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی کی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہوگئیں۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے تمام اتحادوں کو توازنِ قوت کی حکمتِ عملی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ان میں قومیت کی زیادتیوں کو روکنے کی بہت کم قوت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اس قوت کو استعمال کریں تو جبری مداخلت کے علاوہ خوف ناک خوں ریزی اور بے حساب رُپے سے کام لیا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایسے اتحادوں پر قابو رکھنا اور ان کو متفقہ طور پر قائم رکھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اتحادیوں کو جب کبھی صلح کر لینے میں سہولت نظر آتی ہے، وہ اپنے دوستوں کو پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر علیحدہ صلح کر لیتے ہیں۔ اسی طرح حملہ آور قوم میں متحدہ کمال اس کے لیے فوجی استبداد کے زبردست مواقع پیدا کر دیتی ہے۔

(۳) معاہدے جارحانہ قومیت کی بُرائیوں کو روکنے کی ایک اور کوشش یورپی معاہدوں کا طویل سلسلہ ہے۔ یہ معاہدے مختلف وقتوں میں ایک جنگ کے بعد صورت حال کو ٹھیک کرنے اور آیندہ لڑائیوں کو روکنے کے لیے ترتیب دیے گئے تھے۔ پہلا کل یورپی معاہدہ، وسٹ فالیہ کا معاہدہ تھا، جس نے ۱۶۴۸ء میں تیس سالہ جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ انگلستان کے سوا یورپ کی تمام بڑی اور بہت سی چھوٹی سلطنتیں اس معاہدے میں شریک تھیں۔ اس سے جرمن رئیسوں کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ آزادی مل گئی، کیوں کہ اس معاہدے کی رُو سے وہ جرمن شہنشاہ کی اجازت کے بغیر صلح یا جنگ کر سکتے تھے۔ اسی نے فرانس، سویڈن اور بران ڈن برگ (پروشیا) کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے

سوئزرلینڈ اور ہالینڈ کی قومیت کو باضابطہ تسلیم کرا دیا۔ کیوں کہ سوئزرلینڈ نے آسٹریا اور ہالینڈ نے اسپین کی شہنشاہیت کے خلاف کامیاب بغاوت کی تھی۔

لوئی چہار دہم کے خلاف بڑی بڑی لڑائیوں کے بعد متعدد اہم عہد نامے مرتب کیے گئے۔ ان عہد ناموں میں سب سے آخری عہد نامہ یوٹ رخ کا عہد نامہ ہے۔ جنگ میں مارلبرو کی شان دار فتوحات کے باوجود فرانس کے ہوشیار بادشاہ نے اپنے مخالف زبردست اتحاد کی کمزوریوں اور نفاق سے فائدہ اٹھا کر اس طرح مرتب کیا کہ یہ خود بھی اس کی فتح سے کچھ کم نہ تھا۔ چناں چہ لوئی نے اسپین کا تاج اور اس کا بڑا علاقہ اپنے خاندان کے لیے حاصل کر لیا۔ جرمن شہنشاہ نے جو دراصل ۱۴۳۸ء کے بعد سے آسٹریا کا شہنشاہ بن گیا تھا، اطالیہ اور ندرلینڈ کے بڑے بڑے علاقے حاصل کر لیے۔ اس طرح جو ملک حاصل ہوا وہ فرانس سے نہیں بلکہ اسپین سے لیا گیا۔ اسی معاہدے کی رو سے پروشیا کا ئلک ایک سلطنت بن گیا، اور سیوائے کا علاقہ صقلیہ کے عطیے سے شاہراہ ترقی پر گام زن ہو گیا۔ یہی وہ علاقہ ہے جو ڈیڑھ سو سال بعد سلطنت متحدہ اطالیہ کا مرکز بننے والا تھا۔

اٹھارھویں صدی کے بقیہ حصے میں کل یورپی تین معاہدے اور ہوئے۔ آسٹریا کی جانشینی کی لڑائی (۱۷۴۸ء) اور سات سالہ جنگ (۱۷۶۳ء) کو ختم کر دینے والے معاہدوں کے بعد سے پروشیا نے ایک حریص اور دست دراز قوت کی صورت اختیار کر لی۔ یورپ اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے سے عاجز تھا۔ اور ادھر انگلستان کی نوآبادیاتی ریاستوں کو مستقل طور پر عروج ہو رہا تھا۔ چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی جنگ کے اختتام پر (۱۷۸۳ء) ممالک متحدہ نے اپنی آزادی حاصل کر لی۔

نپولینی جنگوں کے اختتام پر ویانا کی کانگریس (۱۸۱۴ء-۱۸۱۵ء) نے گزشتہ تیئس سالہ جنگ وجدل اور مصیبتوں کے بعد دائمی امن کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ بعض لحاظ سے اس کا کام اطمینان بخش رہا۔ فرانس کی غلط کاریوں کے باوجود اس سے ناواجبی سختی کا برتاؤ نہیں کیا گیا، اور اس کو اپنی قدیم سرحدوں کو برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ پروشیا کی یہ تجویز کہ فرانس کو آلیس اور لورین کے علاقوں سے محروم کر دیا جائے مسترد کر دی گئی۔ بردہ فروشی کو ممنوع قرار دیا گیا۔ سوئٹزرلینڈ کے علاقے میں توسیع کی گئی اور اس کی دائمی غیر جانب داری کی ضمانت دی گئی۔ توازنِ قوت کو، جسے نپولین نے بڑی طرح درہم برہم کر دیا تھا، اتنی اچھی طرح پھر قائم کیا گیا کہ وہ مزید چالیس سال تک برابر باقی رہا۔ لیکن متعدد طریقوں سے بڑی شہنشاہی مملکتوں کے لیے کم زور قومیتوں کے حقوق کی بھینٹ دی گئی۔ پولینڈ کو آسٹریا اور روس کے درمیان تقسیم کر دیا گیا، اور روس کو اس کا بڑا حصہ ملا۔ فن لینڈ کو بھی روس کے حوالے کر دیا گیا۔ روس اب فرانس کے بعد یورپی آزادی کا سب سے بڑا دشمن اور توازنِ قوت کو درہم برہم کرنے والا بن گیا تھا۔ پروشیا کو بڑے بڑے اور اہم علاقے دیے گئے، اور اس سے وہ جرمنی میں کامل برتری حاصل کرتا گیا۔ اطالیہ کا جنوبی علاقہ آسٹریا کے حصے میں آیا جہاں اس کی حکومت غیر مقبول تھی اور جہاں وہ اطالوی مزاحمت کی وجہ سے مظالم ڈھا رہا تھا۔ بلجیم کی گردن پر ہالینڈ کے ناگوار اتحاد کا جوا رکھ دیا گیا، جسے ولندیزیوں کے خلاف ایک بلجیمی بغاوت نے ۱۸۳۰ء میں ختم کر دیا۔ اس کے بعد مشہور انگریز مدبر پامرسٹن کو اس مشہور "کاغذ کے پرزے" کے متعلق سلسلہ جنبانی میں کامیابی ہوئی۔ جس میں بلجیم کی غیر جانب داری کی ضمانت دی گئی تھی، اور جس کو چاک

کر دینے کی وجہ سے ۱۹۱۴ء میں جرمنی کے خلاف برطانیۂ عظمٰی نے جنگ میں شرکت کی تھی۔

انیسویں صدی کے بقیہ حصے میں بہت سی لڑائیاں اور بہت سے معاہدے ہوئے لیکن ان میں ایک بھی کل یورپی اہمیت رکھنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔ جنگ کریمیا (۱۸۵۴ء۔ ۱۸۵۶ء) جس نے روس کی وجہ سے توازن پھر قائم کر دیا، نسبتاً ایک چھوٹا سا معاملہ تھا۔ یہی حال ان جنگوں کا تھا، جن میں اطالیہ نے اپنی قومیت حاصل کر لی۔ جرمن سلطنت، آسٹریا کے ساتھ ایک مختصر جنگ (۱۸۶۶ء) اور نپولینی سلطنت سے کم درجے نئی فرانسیسی سلطنت کے ساتھ نسبتاً ایک زیادہ اہم جنگ (۱۸۷۰ء) کے بعد اپنی جدید اور اعلا درجے کی منظّم شکل میں قائم ہو گئی۔ اس عہد نامے سے جس پر جنگ ختم ہوئی؛ جدید جرمنی کے اس جذبے کو ظاہر کر دیا جس سے وہ مغلوب ہو رہا تھا۔ فرانس سے دو بڑے بڑے صوبے چھین لیے گئے اور فرانس کو آتشِ انتقام میں جلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

(۴) یورپی سنگت انیسویں صدی کے آخری حصے کے دوران میں یورپی معاملات کی راہ نمائی اور توازنِ قوت کی حمایت بڑی بڑی سلطنتوں کے ایک فضول سے راضی نامے سے کی گئی تھی۔ یہ راضی نامہ بعض وقت "یورپی سنگت" کہلاتا ہے۔ جرمنی، روس، آسٹریا، فرانس، انگلستان اور اطالیہ (اگرچہ یہ کم اہمیت رکھتا تھا) تمام اہم مواقع پر کم و بیش دوستانہ مفاہمت پر راضی ہو گئے تھے۔ اس سنگت کا سب سے اہم کارنامہ برلن کی کانفرنس ہے جس نے روس اور ترکی کی جنگ (۱۸۷۷ء۔ ۱۸۷۸ء) کو بند کرا دیا۔ دوسری سلطنتوں نے مل کر ترکوں پر روسیوں کی کامل فتح کے ثمرات سے

روس کو محروم کر دیا۔ روس کو یورپ میں ترکی سلطنت کا خاتمہ کر دینے اور اس کی جگہ اس سے زیادہ وسیع بلغاری سلطنت بنانے سے باز رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بلقان میں آزاد یا نیم آزاد ریاستیں قائم کی گئیں لیکن ملک کے بڑے حصے پر ترکی ہی کا قبضہ رہا۔ اس انتظام میں' اور ایسے ہی متعدد دیگر مسائل کے حل کرنے میں یورپی سنگت نے ایک عام اتفاق پر پہنچنے کا ایک بھونڈا سا طریقہ استعمال کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ان بڑی بڑی سلطنتوں کے درمیان نازک اختلاف کے رونما ہونے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں رفتہ رفتہ یہ بھونڈا سا یورپی سنگت ناپید ہو گیا۔ اور اس کی جگہ دو جماعتیں —— جرمنی، آسٹریا اور اطالیہ کا اتحادِ ثلاثہ اور روس، فرانس اور انگلستان کا ائتلافِ ثلاثہ —— پیدا ہو گئیں۔ اس کے بعد جنگِ عظیم شروع ہوئی، اس میں اطالیہ نے بے حد پس و پیش کے بعد اپنے اتحاد میں تبدیلی کر لی۔ اور ائتلافِ ثلاثہ کا شریک ہو گیا۔

جنگِ عظیم کے خاتمے پر ۱۹۱۹ء میں دُنیا کی از سرِ نو تعمیر کے لیے دُنیا کی سب سے بڑی صلح کانگریس منعقد ہوئی۔ اس پیرس کانفرنس کے نتیجے کے طور پر جو مسلسل معاہدات کیے گئے ان میں تمام قوموں کی خود مختاری کے حق کو تسلیم کیا گیا، چاہے ایسی قومیں کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہوں۔ بعض لحاظ سے اس میں خطرناک غلطیاں ہوئیں، لیکن اس کے ساتھ ہی آیندہ کے لیے قومیت کی بدعنوانیوں کو روکنے کے لیے کافی غور و فکر کے بعد مجلسِ اقوام مرتب کی گئی۔

(۵) بین قومی ثالثی

گزشتہ صدی کے دوران میں جنگ کے موقعوں کو کم کرنے کی کوشش میں تھوڑی بہت کامیابی ضرور

حاصل ہوئی ہے۔ بعض سلطنتوں نے باہمی اتفاق سے آپس کے متنازع مسائل کو ثالثی کے لیے ایک غیر جانب دار عدالت میں پیش کرنے کی پابندی قبول کرلی۔ اس قسم کا پہلا اہم راضی نامہ ۱۸۹۴ء میں برطانیۂ عظمیٰ اور ممالکِ متحدہ امریکہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ، معاہدہ جیئے کہلاتا ہے۔ اس کے بعد سے اسی قسم کے متعدد معاہدے مرتب ہوئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسے معاہدوں نے قوت کی جگہ انصاف کے ذریعے سے جنگ و جدل کے مواقع کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ریاستیں اپنے متنازع مسائل کو اس قسم کی ثالثی عدالتوں میں پیش کرنے کو اپنی عزت اور اپنی آزادی کو متاثر کرنے والی چیز سمجھتی ہیں۔ اس لیے وہ ایسی ثالثی عدالتوں سے نفرت کرتی ہیں۔ چناں چہ یہ نفرت خاص طور پہ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنسوں میں بہت نمایاں ہوگئی۔ اس سے اگرچہ بین قومی ثالثی نظری طور پر کتنی ہی قابلِ تعریف نہ بن گئی ہو، لیکن بین قومی بے اعتمادی اور دشمنی کے امراض کے علاج کے لیے یہ عملاً بہت ناموزوں ہے۔

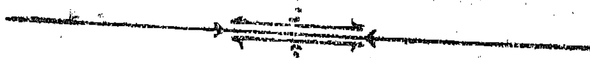
بین قومی اقتدار کی ضرورت

مذکورہ بالا اعتراض جو ثالثی معاہدوں کے ساتھ مخصوص ہے اس کے علاوہ ان تمام معاہدوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ جارحانہ کارروائیوں کو روکنا تو چاہتے ہیں، لیکن ان پر عمل کرانے میں انھیں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ معاہدے کے فریقوں کے اوپر کوئی ایسا اعلا اقتدار نہیں ہے جو معاہدے کے شرائط کو مخصوص فائدے کے لیے توڑنے سے موثر طور پر باز رکھ سکے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی نے "کاغذ کے پرزے" کو چاک کردیا، حالاں کہ اس پر خود جرمنی نے اپنے دستخط کیے تھے اور بلجیم کی غیر جانب داری کی ضمانت دی تھی۔ جرمن کا یہ فعل صرف اس حقیقت کی ایک مثال ہے کہ جب کوئی قوم لڑنے پر تُل جاتی ہے یا اسے مہیب

فوجی ضرورت پیش آتی ہے، تو اس کو اپنی عزت کا بھی خیال نہیں رہتا۔ اس کو ان معاہدوں کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا جن کی ترتیب خود اس کی مدد سے ہوئی تھی اور جن کے احترام کا اس نے وعدہ کیا تھا۔

جس طرح توازنِ قوت ایک ناقابلِ اعتماد انتظام ہے اور اس کے ہر لمحہ درہم برہم ہوجانے کا ڈر ہے، جس طرح اتحادات کسی غلط حکمتِ عملی کو درست کرنے کی بے ڈھنگی اور گراں خرچ کوششیں ہیں، جس طرح بڑی بڑی سلطنتوں کی تنگ خود غرض شہنشاہیت سے دنیا کو زیادہ دنوں تک نہ بچاسکی، بالکل اسی طرح معاہدات بھی ناکام رہے ہیں۔ یہ معاہدے بڑی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ مرتب اور سنجیدگی کے ساتھ منظور بھی کیے گئے ہوں تو بھی ایک ایسی بین قومی قوت کی غیر موجودگی میں جو معاہدوں کی پابندی پر مجبور کرسکے، بالکل بے کار ثابت ہوتے ہیں۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ کوئی قوم اپنی سربلندی یا اپنی جان بچانے کے لیے جی توڑ کر لڑ رہی ہو تو وہ ان سے دفعتاً بے التفاتی برتتی اور ان سے دست بردار ہوجاتی ہے۔

پس اس سے ظاہر ہے کہ قومیت کے ہاتھوں تہذیب کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے ایک ایسے بین قومی ادارے کی ضرورت ہے جو ایک انفرادی قوم سے برتر ہو۔ اب ہمیں ان کوششوں اور ان خطوطِ عمل کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس قسم کے اقتدار کے قائم کرنے کے لیے کی گئی ہیں اور جن سے ایسی کوششوں میں کام یابی کے حصول کو بہت زیادہ امید ہے۔



آٹھواں باب

بینِ قومیت

مجلسِ اقوام

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں صلح کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ یہ کانفرنسیں زارِ روس کی کوششوں کی رہینِ منت تھیں۔ ان کانفرنسوں نے قومی اسلحہ سازی پر تحدید عائد کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بینِ قومی ثالثی کی مستقل عدالتیں قائم کی گئیں تاکہ ایسی نزاعوں کا تصفیہ کیا جائے جو خوشی سے ان کے سپرد کی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی دورِ حاضر کی جنگی وحشتوں کو کم کرنے کے لیے قواعد بھی مرتب کیے گئے۔

لیکن جنگِ عظیم کے چھڑتے ہی جنگ میں زہریلی گیس بے روک ٹوک استعمال ہونے لگی۔ ہوائی جہازوں سے شہروں پر بم باری کی گئی۔ اور آب دوز کشتیوں سے ہسپتالی اور تجارتی جہازوں کو تباہ کیا جانے لگا۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ جنگ سے بچنے یا اگر جنگ چھڑ جائے تو اس کو مہذب بنانے کی جو کوشش ہیگ یا دوسرے مقاموں پر کی گئی تھیں، وہ سب بے سود ثابت ہوئیں۔

پیرس کی صلح کانفرنس ۱۹۱۹ء کے دوران میں مسٹر ولسن صدر جمہوریہ امریکہ نے دنیا کے امن اور تہذیب کی ترقی کی ضمانت کے لیے مجلسِ اقوام کی تخلیق کو اپنا اصلی مقصد قرار دیا تھا۔ پریسڈنٹ ولسن اور انگریز سیاس

لارڈ سیل کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ آخر کار مجلسِ اقوام قائم ہوئی اور اس میں چالیس سے زیادہ قوموں نے شرکت کی۔ اس کے لیے ایک مستقل انتظامی محکمہ قائم کیا گیا اور لیگ کا صدر مقام جنیوا قرار پایا۔ "لیگ کا کام ایک مجلس کے ذریعے سے انجام پاتا ہے اور اس مجلس میں ہر مملکتی نمایندہ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں ایک کونسل بھی ہوتی ہے جو پانچ بڑی متحدہ سلطنتوں اور چار دوسری ریاستوں کے نمایندوں پر مشتمل ہے۔ ان نمایندوں کا انتخاب مجلس کیا کرتی ہے۔"
اس طرح یہ انتظام ایک حقیقی بین قومی حکومت کا ڈھانچا پیش کرتا ہے۔ یہی حکومت دنیا میں امن قائم کرے گی اور ہر ایسی ریاست کے خلاف جو جنگ کی ابتدا کرتی ہے، جارحانہ کارروائیوں کو روکتے ہیں تہذیب کے تمام موثر اور از خود کام کرنے والے ذرائع استعمال کرے گی۔ مجلس کے آگے اب تک بہت سے پیچیدہ بین قومی مسائل پیش کیے جا چکے ہیں۔

لیگ کی مشکلات

اس قاعدے کی رو سے کہ لیگ کے فیصلوں کو موثر بنانے کے لیے کونسل کا متفق ہونا ضروری ہے، لیگ بڑی مشکل میں پڑ گئی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس وقت مجلس میں روس، جرمنی اور دُوَل متحدہ امریکہ شریک نہیں ہیں، اس لیے ان بڑی قوموں کی شرکت کے بغیر اس کی سرگرمیاں اور فیصلے دُنیا کی حقیقی نمایندہ رائے ہونے کا دعوا نہیں کر سکتے۔ دُوَلِ متحدہ امریکہ کا اس میں شرکت سے انکار اس امریکی روایتی خطرے کا نتیجہ ہے کہ اس طرح امریکہ اپنے آپ کو یورپ کے پیچیدہ مسائل میں الجھالے گا۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ افسوس ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ جنگِ عظیم کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس نے دُوَلِ متحدہ کو دنیا کی سب سے زیادہ زبردست اور دولت مند قوم بنا دیا ہے۔ مجلس اس وجہ سے بھی بڑی

مصیبت میں ہے کہ اس کے پاس اپنے فیصلوں کو جبراً نافذ کرنے کے ذرائع ناپید ہیں۔ لے دے کر اس کے پاس بس یہی حربہ ہے کہ لیگ کے اراکین ضرر رساں فریق پر معاشی دباؤ ڈالیں۔

اس طرح اس وقت مجلس ایک کم زور اور معطل حالت میں ہے۔ تاہم امید ہے کہ خود یہی لیگ یا اسی قسم کی کوئی اور مجلس جس میں دنیا کی تمام قومیں شریک ہوں گی، انسانیت کی رائے عامہ کو قطعی طور پر اس طرح ظاہر کر سکے گی کہ جارحانہ قومیت کی دست درازیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اس دوران میں ہر وہ کوشش جو تخفیفِ اسلحہ کے لیے کی جائے، وہ دلی خیر مقدم کی مستحق ہے۔ اس سے یورپ کی جنگِ عظیم سے پہلے کی حالت کے پھر دوبارہ رونما ہونے کا امکان کم ہو جائے گا۔ اس وقت یورپی قومیں بڑی بڑی میدانی اور بحری فوجوں کے بوجھ سے دبی جا رہی تھیں۔ یہ فوجیں ایسی تھیں کہ ان کے وجود ہی نے اسلحہ کی عظیم صنعت کی مدد سے عالمی جنگ کے جلد چھڑ جانے کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ ان میں کسی طرح تخفیف کی ہی نہیں جا سکتی تھی، سوائے اس کے کہ ایسی قومیں جن کے قبضے میں یہ اسلحہ تھے، اپنے ہمسایوں اور حریفوں کے برابر کم زور کر دی جاتیں۔

برطانوی دولت عامہ اقوام[1]

مجلسِ اقوام اس چیز کا ایک جز توہے جو کسی روز ترقی کر کے ایسا اقتدار بن جائے گی جو بین قومی جنگ کے چھڑ جانے کو روک سکے گی۔ تاہم دنیا

---

[1] آئرستان اور حکومت برطانیہ کے درمیان ۱۹۲۱ء میں جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں یہ اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ "سلطنت برطانیہ" کی قدیم اصطلاح سے زیادہ موزوں ہونے کی وجہ سے ہم نے اب یہاں استعمال کیا ہے۔

میں اس وقت حقیقتاً دو ایسی بین قومی مجلس موجود ہیں جو ریاستوں اور عوام کی خواہشِ آزادی کو برقرار رکھ کر ایک باثر کل میں متحد کرنے کے دو مختلف طریقوں کی عملی مثال پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک برطانوی دولتِ عامہ اور دوسری دُولِ متحدہ امریکہ ہے۔

دُنیا کے آیندہ وفاق میں ہر فرد اور ہر ریاست کو تمام انسانیت کے مفاد کے لیے آزادانہ خدمت گزاری کا پورا پورا موقع ملے گا۔ اس وفاق کو زبان، قومی رقابت اور عملی انتظامات میں برطانوی دولتِ عامہ اور دول متحدہ کو جو دشواریاں پیش آچکی ہیں، ان سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ان مجلسوں کے سرسری مطالعے سے ہمیں ترقی کی بعض ایسی شاہ راہوں کا پتا چلے گا، جن کے ذریعے تہذیب کو بچالیا جاسکے گا اور دُنیا کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

تجارتی نوآبادیاں برطانوی دولتِ عامۂ اقوام کا آغاز سولھویں صدی میں ہوا جب کہ مہمات پسندی، نئے ملکوں کی دریافت کا جذبہ اور بیرونی نوآبادیاں قائم کرنے کی آتشِ شوق ہسپانیوں، پرتگالیوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کی طرح انگریزوں کے دلوں میں بھی خوف ناک طور پر بھڑکنے لگی۔ سمندر پار کے اس میدانِ ترقی میں انگلستان نسبتاً دیر سے آیا۔ لیکن تجارتی مہمیں مشرق اور مغرب میں بھیجی جاچکی تھیں۔ بہت سے تجارتی مقامات اور کئی "فیکٹریاں" قائم ہوگئی تھیں۔ خاص طور پر ہندستان میں دوسری یورپی قوموں سے کام یاب سابقت، انگریزی تجارت اور اثر کی توسیع کی قدرتی خواہش اور ملک میں طویل بدامنی کے دوران میں (جس نے سلطنتِ مغلیہ کا خاتمہ کردیا) تحفظ کے حصول کی ضرورت نے اٹھارھویں صدی کے اختتام پر برطانوی اقتدار قائم کردیا۔ پہلے پہل ہندستان میں حکومتی اقتدار قدیم تجارتی

کمپنی کے ہاتھوں میں رہا، لیکن ۱۸۵۹ء میں تاجِ برطانیہ کو منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد نظم و نسق ایک وائسرائے کے ذریعے اور پبلک خدمات کا انتظام انگریز اور ہندستانی عہدے داروں کے ذریعے سے کیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ایک اصلاحی اسکیم نافذ کی گئی، جس نے حکومت کے مختلف شعبوں کو ہندستانی وزیروں کے حوالے کر دیا۔ یہ وزیر اسمبلیوں کو منتخب کرنے کے ذمے دار ہیں۔ اس طرح اختیارات میں آیندہ جو وسعت دی جائے گی اس کا منتہا برطانوی دولتِ عامہ اقوام کے ماتحت ہندستان کی حکومتِ خود اختیاری ہوگا۔

امریکی نوآبادیاں

تجارتی نوآبادی (جس کی سب سے زیادہ قابلِ لحاظ مثال ہندستان میں برطانوی حکومت ہے) ایک بالکل آباد کار نوآبادی ہے۔ اس طرح کی نوآبادیوں کی ترقی نے برطانوی دولتِ عامہ اقوام کو ایک نمایاں خصوصیت عطا کی ہے۔

سولھویں صدی میں اسپینی باشندے وسطی اور جنوبی امریکہ میں خوش حال نوآبادیاں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سترھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں انگریزوں نے ان کی تقلید کی اور جنوبی امریکہ کے مشرقی ساحل پر اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ شمال میں جو نوآبادیاں تھیں ان کا انتظام زیادہ تر دولت مند درباریوں اور اشرافیہ کے ہاتھوں میں تھا اور ان کے ادارے اور مقاصد بھی یہی تھے۔ ان کا دار مدار بیشتر روئی کی کاشت پر تھا جس میں افریقہ سے ناروا طریقے پر لائے ہوئے غلام مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔ دوسری طرف شمال میں انگلستان سے بھاگے ہوئے مذہبی پناہ گزینوں نے نوآبادیاں قائم کی تھیں۔ ان میں زیادہ تر انتہا پسند پروٹسٹنٹ یعنی پیورٹن تھے۔ یہ نوآبادیاں زرعی تھیں اور بعد میں صنعتی جماعتیں بن گئیں۔ ان کے ادارے

اور مقاصد جمہوری تھے۔ ان کی گزر کا انحصار آباد کاروں کی محنتِ شاقہ پر تھا۔
یہاں اس سے پہلے خوف ناک جنگل تھے اور ان میں خون خوار وحشی بستے تھے۔
رفتہ رفتہ یہ منتشر نوآبادیاں خوش حال اور وسیع ہوتی گئیں، یہاں تک
کہ دریائے سینٹ لارنس کے دہانے سے لے کر فلوریڈا کی سرحد تک برطانوی
نوآبادیوں کی ایک مسلسل قطار بن گئی۔ اب تک آباد کار اندرونِ ملک میں دور
تک نہیں بڑھے تھے، اور انگریزی نوآبادیوں کے مغرب اور سینٹ لارنس
اور مس سپی کی وادیوں پر فرانسیسی عرصۂ دراز سے قابض تھے۔ تاہم سات سالہ
جنگ کے نتیجے کے طور پر فلوریڈا اور کنیڈا انگلستان کے سپرد کر دیے گئے (۱۷۶۳ء)
اس کے بعد برطانوی حکومت نے آباد کاروں کی بڑھتی ہوئی دولت پر محصول
اور نا واجبی تجارتی پابندیاں عائد کرنے کی تباہ کن کوشش کی۔ برطانوی آزادی
کا یہ نعرہ کہ "نمایندگی کے بغیر کوئی محصول ادا نہیں کیا جائے گا" منشورِ اعظم کے
زمانے سے چلا آتا تھا۔ اب اس کو نوآبادیوں نے پُرجوش طریقے پر اختیار کر لیا،
جن کے پارلیمنٹ میں کوئی نمایندے نہیں تھے۔ مادرِ انگلستان اور امریکیوں
کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ نوآبادیوں کو وسیع تر بن مراعات دے کر
ہی جنگ سے بچنے کی صورت نکالی جا سکتی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت نے
رجو اس وقت نااہل اور خود پرست شاہ جارج سوم کی غلامم وزارت کے زیرِ
اقتدار تھی) وسیع پیمانے پر ایسے مراعات دینے سے انکار کر دیا۔ "حکومتِ
برطانیہ نے مساوی حصہ نہیں دیا جو اس مسئلے کو حل کرنے کی ایک ہی تدبیر
تھی۔ اس کے برخلاف اس نے امریکہ کے ساتھ ایک ماتحت ریاست کا سا
سلوک کیا۔"
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی، جو آٹھ سال (۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۳ء)

تک جاری رہی۔ اس خانہ جنگی میں تیرہ نوآبادیاں اپنے آپس کے اختلافات اور رقابتوں کو پیچھے ڈال کر برطانیہ کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آگئیں۔ جارج واشنگٹن نے قابلِ تعریف طور پر ان کی قیادت کی۔ ہالینڈ، فرانس اور اسپین نے انھیں مدد دی اور انگریزوں کو کوئی اتحادی نہ مل سکا۔ آخرکار انگریزوں کو شکست ہوئی اور امریکی نوآبادیوں نے دُوَلِ متحدہ امریکہ کی صورت میں اپنی آزادی حاصل کرلی۔

مقبوضات

لیکن اس سبق سے رفتہ رفتہ برطانوی حکومت کی آنکھیں کھل گئیں، اور جب انیسویں صدی میں کنیڈا اور دوسری نوآبادیوں کی طرف سے حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ ہوا، تو ان مطالبوں کو پوری طرح تسلیم کرلیا گیا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جنوبی افریقہ کی بوئر حکومت کے ساتھ بھی یہی کیا گیا، حالاں کہ اس سے کچھ ہی سال پہلے بوئر اپنی آزادی کی ایک جان توڑ کوشش میں ہزیمت اٹھا چکے تھے۔

غرض اس طرح کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ میں مقبوضاتی خود اختیاری حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یہ مقبوضات مادرِ وطن انگلستان سے صرف محبت اور ہم دردی کے رشتے میں منسلک اور عام اطاعت کے ذریعے برائے نام تاجِ برطانیہ کے زیرِ اقتدار ہیں۔

لیکن ایک طرف اگر یہ مقبوضات اتنی مکمل حکومتِ خود اختیاری رکھتی ہیں کہ ۱۹۱۹ء کی صلح کانفرنس اور مجلسِ اقوام میں ان کا شمار علیحدہ ریاستوں کی حیثیت سے ہوا اور اب بھی ہوتا ہے تو دوسری طرف معاملاتِ خارجہ اور ایسے امور میں جو برطانوی دولتِ عامہ کے آپس کے تعلقات کو متاثر کرتے ہیں، وہ ان مسائل کو ایک متحدہ جماعت کی حیثیت سے حل کرتے ہیں۔ ان کا

ایسا کرنا بالکل اختیاری ہوتا ہے۔ کیوں کہ دستور میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ جرمنی کی جنگِ عظیم میں مقبوضات نے انتہائی وفاداری کے ساتھ مادرِ وطن کا ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ اہم اور کامیاب شہنشاہی کانفرنس میں جو حال ہی میں منعقد ہوئی تھی، ایسے جراثیم پائے گئے جن سے قریبی تعلقات کے التوا ہونے اور پوری دولتِ عامہ کی حکمتِ عملی اور انتظام پر ایک زیادہ مفید مرکزی اقتدار کے پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

آئرلینڈ ۱۹۲۱ء میں آئرلینڈ کو حکومتِ خود اختیاری عطا کی گئی۔ اور وہ ایک نوآبادی کی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانیہ عظمیٰ کے مساوی ایک قدیم مادرِ وطن کی حیثیت سے برطانوی دولتِ عامۂ اقوام کا رکن بن گیا۔ آئرلینڈ نے ایک نئی مثال قائم کردی ہے کہ قومیں کس طرح آپس میں متحد کی جاسکتی ہیں۔ یہ قومیں اپنی طرز پر زندگی بسر کرتے، اپنے معاملات کا آپ انتظام کرنے اور تمدن کو ترقی دینے میں آزاد ہوں گی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کامل علیحدگی کے ساتھ انفرادی طور پر کبھی بھی جداگانہ ہوں گی۔ ان کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ بڑے مواقع میں شرکت کریں اور اپنے خیالات اور تجربے سے ایک بڑے ادارے کو فائدہ پہنچائیں، اور یہ ادارہ رفتہ رفتہ پوری انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔

اس طرح برطانوی دولتِ عامہ، عالمی ریاست کے قیام میں مجلسِ اقوام کے اختیار کردہ راستے سے الگ ایک دوسری راہ سُجھاتی ہے۔ آخرالذکر انگلستان کے خلاف جنگ میں امریکی نوآبادیوں کے اتحاد سے مشابہ ہے۔ یہ مساوی رتبہ ریاستوں کی ایک انجمن ہے، جو اس خاص مقصد کے لیے بنائی گئی ہے کہ جارحانہ قومیت کی روک تھام کی جاسکے۔ دوسری طرف برطانوی دولتِ عامہ اقوام قوموں کا اتحاد ہے جو تاریخی حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے منسلک

اور ایک مرکزی مملکت کے گرد ایک مشترک مقصد کے ماتحت جمع ہو گئی ہیں۔ ان کو مقاصد اور روایات کے ایک مجموعے نے متحد کر رکھا ہے۔

برطانوی دولتِ عامہ اقوام کی مثال ایک خاندان کی سی ہے۔ اس کی جذبات اور اس کے مشترکہ اغراض و مقاصد خاندانی زندگی جیسے ہیں۔ لیکن تعلقات کے لیے کوئی مقررہ قواعد نہیں ہیں، اور اس کے ہر انفرادی رکن کو پوری پوری آزادی عطا کی گئی ہے۔ دوسری طرف مجلسِ اقوام چند خاندانوں کے سرداروں کی ایک مجلس ہے جس میں ہر سردار اندرونی طور پر رشک و حسد اور اپنے عزائم کی پرورش کرتا ہے۔

برطانوی دولت عامۂ اقوام کا دستور

اس طرح برطانوی دولت عامۂ اقوام آزاد مملکتوں کی ایک مجلس ہے۔ یہ بہ طور ایک متحدہ جماعت کے کام کر سکتی ہے؛ اور اس کے باوجود ہر حصے کی آزادی کو انتہائی درجے تک محفوظ رکھ سکتی ہے۔ "سلطنت" کی قدیم اصطلاح ایسی دوستانہ جماعت کے لیے ناموزوں ہے جو باہمی امداد کے لیے بنی ہو اور جبری بندشوں سے نہیں بلکہ ولی جذبے سے اتحاد میں منسلک ہوئی ہو کیوں کہ واقعی سلطنت میں مرکزی حکومت اپنے ماتحت ریاستوں کو اپنے ذاتی نفع کے لیے بے رحمی کے ساتھ لوٹتی ہے۔

سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز برطانوی دولتِ عامہ اقوام کی یہ ہے کہ یہ دستور لوچ دار اور غیر معین ہے۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ کسی ایسی دستاویز پر لکھا نہیں گیا ہے، جس میں اس کے اور ماتحتی ریاستوں کے تعلقات کا صراحت کے ساتھ ذکر ہو۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ریاست دولتِ عامہ سے علیحدہ ہونا چاہے تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں۔

تجربے نے ثابت کیا ہے کہ مقررہ دستور واضح اور معین ہونے کے باوجود سخت ہونے کی وجہ سے بڑی طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ ایسے دستور ضرورت سے زیادہ سخت قواعد اور تحفظات سے جو صرف ماضی کے مختلف حالات میں قابلِ عمل ہوتے ہیں، مستقبل میں بڑی پریشانی کا باعث ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ریاست، یا ریاستوں کی ایک مجلس کسی زبانی اور لوچ دار دستور کے ساتھ مستقل طور پر آسانی کے ساتھ ترقی کر سکتی ہے اور جدید مسائل کی ضروریات کے مناسبِ حال نئے قانون مرتب کر کے باقاعدہ اور قدرتی طریقے پر ارتقا اور وسعت کو جاری رکھ سکتی ہے۔ مجموعی طور پر انگلستان اور برطانوی دولتِ عامۂ اقوام نے اسی طریقے پر ترقی کی ہے۔ مختلف ملکوں کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ ایک مقررہ دستور کا وجود سخت خطرے کا موجب ہوتا ہے، جب کہ تبدیل شدہ حالات کے ماتحت اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی تبدیلیاں صرف ایک اچانک انقلاب یا خانہ جنگی ہی کے ذریعے کی جا سکتی ہیں۔ ۱۷۸۹ء سے فرانس میں جو واقعات پیش آ رہے ہیں، ان سے یہ خطرہ روزِ روشن کی طرح واضح ہوتا جا رہا ہے۔

برطانوی دولتِ عامہ میں محبت، اغراض اور آزادی کے اصولوں کی عام اطاعت کے رشتے دولتِ عامہ کو بیرونی خطرے کے وقت ایک ٹھوس ادارہ بنانے ہی میں مضبوط ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ سیاسی میانہ روی کی روح کو پرورش دینے اور اقلیت کو اکثریت کے فیصلوں پر خوشی سے رضامند بنانے میں بھی (اگرچہ کہ وہ انتہائی ناپسند ہوں) بہت کامیاب رہے ہیں۔ یہی آخر الذکر خصوصیت غالباً ایک کامیاب اور منظم جمہوریت کے لیے اور تمام دوسری ضروریات میں سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم دیکھ چکے

ہیں کہ اسی فقدان نے یونانی جمہوریت کو تباہ کر دیا تھا۔

اس میں کسی کو شک نہیں کہ انگلستان کی طرف سے مادرِ وطن کی مرضی کو مقبوضات سے جبراً منوانے کے لیے ناواجبی دباؤ کا نتیجہ دولتِ عامہ کی تباہی ہوگا۔ اس بات کا علم ایک طرف تو مقبوضات کی آزادی کی ضمانت کرتا ہے اور دوسری طرف مرکزی حکومت پر سنجیدگی اور اعتدال کی ذمے داریاں عائد کرتا ہے۔ اس طرح خاندانی محبت کا تعلق برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا تعلق سب سے زیادہ قوی ہوتا ہے کیوں کہ اس کی بنیاد نہ جبر پر ہوتی ہے اور نہ مقررہ قوانین پر۔

برطانوی دولتِ عامہ کے مختلف عناصر

دولتِ عامہ کے اندر ایسی ریاستوں کے علاوہ جنھوں نے ایک طرف قدیم تجارتی نوآبادیوں سے اور دوسری طرف قدیم توطنی نوآبادیوں سے ترقی کی تھی، ایک تیسری قسم کی ریاست بھی ہے۔ اس تیسری قسم میں وسطی افریقہ اور دوسرے مقامات کے بڑے بڑے علاقے شامل ہیں۔ ان علاقوں کی وحشی قومیں جنگوں یا شہنشاہی توسیع کے نتیجے کے طور پر انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان کے ماتحت ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپی قومیں دنیا کے ان حصوں پر جو اب تک یورپی اقتدار کے ماتحت نہیں آئے تھے، قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کش مکش میں مبتلا تھیں۔ اس دوڑ میں انگلستان سب سے آگے نکل گیا۔ اس نے اپنے لیے اہم علاقے حاصل کر لیے۔ ان علاقوں میں اور بھی وسعت ہوئی جب کہ جنگِ عظیم کے نتیجے کے طور پر ایشیا اور افریقہ کے وہ بڑے بڑے علاقے جو پہلے ترکی یا جرمن حکومت کے ماتحت تھے، اتحادیوں کے ہاتھ آئے۔

مجلسِ اقوام کے اقرار نامے میں ان آخرالذکر مقبوضات کا ذکر "تہذیب کی ایک مقدس امانت" کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور "احکام" کے ذریعے ان کے باشندوں کو بدسلوکی اور لوٹ مار سے بچانے اور ان میں تہذیب کے عناصر کو ترقی دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ احکام مجلس کی طرف سے بعض قوموں کے نام کمیشن ہوتے ہیں جو اسی طرح ان علاقوں کا انتظام اور نگہداشت کی ذمے دار قرار دی گئی ہیں۔ حکم نامے اپنا اقتدار مجلسِ اقوام کی قوت پر چلاتے ہیں، اور مجلسِ اقوام یہ اقتدار غیر متمدن قوموں کی امین کی حیثیت سے استعمال کرتی ہے۔ مجلس اس اقتدار کو جو درحقیقت غیر متمدن قوموں کا اقتدار ہے، اس وقت تک استعمال کرتی رہے گی، جب تک وہ خود اس کو استعمال کرنے کے قابل نہ ہو جائیں گی۔ یہ بات صاف طور پر کہی جا سکتی ہے کہ برطانیۂ عظمیٰ جن سلّمہ اساس پر منطقۂ حارّہ کے افریقی مقبوضات اور اسی طرح عراق اور فلسطین پر قابض ہے، چاہے وہ کسی حکم نامے کے ماتحت ہوں یا نہ ہوں، یہ ممالک اسی قسم کی امانت ہیں۔ ان ملکوں کی سیاسی منزلِ مقصود وہی ہے جو اس سے پہلے مقبوضات نے حاصل کرلی ہے ـــــ یعنی حکومتِ خود اختیاری۔

برطانوی دولتِ عامّہ میں ایک دوسرا عنصر بعض اہم فوجی نقاط کا ہے۔ مثلاً جبل الطارق، مالٹا، عدن، ہانگ کانگ۔ ان مقاموں پر اس لیے قبضہ رکھا گیا ہے کہ یہ بڑے بڑے بحری راستوں پر جو دولتِ عامہ کے دور دراز مقاموں کو ملاتے ہیں، کوئلے کے اسٹیشن ہیں۔

اس طرح برطانوی دولتِ عامۂ اقوام میں بہت سے مختلف اور متضاد عناصر ہیں۔ اس کے اندر ہندستان کی قوموں کی طرح قدیم اور بڑی قومیں ہیں۔ یہ قومیں ابتدا میں تجارتی اسباب کی بنا پر برطانوی

اقتدار کے ماتحت آئیں اور اب بہت تیزی کے ساتھ خود مختاری کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں۔ دولتِ عامہ کے اندر کنیڈا اور آسٹریلیا جیسی حکومت خود اختیاری رکھنے والی مقبوضات ہیں۔ اس میں غیر متمدن وسیع علاقے ہیں، جن میں بہت کم تہذیب یافتہ قومیں بستی ہیں۔ اس میں چھوٹے چھوٹے لیکن رسل و رسائل کے نہایت اہم فوجی مقامات نہیں۔ اس کے اندر ایک حصہ سلطنت آئرستان ہے جو خود برطانیہ عظمیٰ کا برابر کا حصے دار ہے۔

بعض ایسی ہی خاندانی قومیں جو مصنوعی اور سخت پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہیں، بلکہ امن و عافیت کے ساتھ مل جل کر رہتی ہیں، ان کے متعلق مختلف نقاط نظر سے یہ نتیجہ نکالنے میں ہم زیادہ غلطی پر نہ ہوں گے کہ یہ قومیں اقوامِ عالم کے آگے آپس کے تعلقات کی ایک بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ اگرچہ اس طرح عالمی دولتِ عامہ کو عملاً قائم کرنے کا امکان اب تک بہت کم نظر آتا ہے۔ تاہم بہت ممکن ہے کہ یہی ایک صحیح دستور کے ساتھ پوری نوع انسانی کی آزادانہ خدمت کے لیے ہر فرد اور ہر قوم کو سب سے زیادہ اطمینان بخش ذرائع مہیا کرے گی۔

دولِ متحدہ مختصر طور پر ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح انگلستان کی امریکی نو آبادیاں آپس میں متحد ہو کر اپنی آزادی کے لیے "مادرِ وطن" سے دست و گریباں ہوئیں۔ اس نئی قوم کو بہت سے مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ شمال اور جنوب دو الگ الگ دنیائیں تھیں۔ جن تیرہ ریاستوں سے پہلے پہل اتحاد ترتیب پایا تھا، ان میں سے ہر ایک کو اس کی سخت فکر تھی کہ مرکزی حکومت ان کے اختیارات میں ذرا سا بھی تصرف نہ کر سکے۔ ان ریاستوں کا وہی حال تھا جو سرحدوں پر ہوا کرتا تھا۔ لوگ

اجڈ، غیر منظم، جاہل اور قانون کے احترام سے ناواقف تھے اور رسل و رسائل کا ان کے پاس فقدان تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود امریکی قوم کی عقلِ سلیم اور ان کی طبیعت کا جوہر ان رکاوٹوں پر بہت جلد فتح پا تا گیا۔

ان کی پہلی اور سب سے بڑی کامیابی غالباً ۱۷۸۷ء کا دستورِ وفاق ہو، جو اب تک نافذ ہو۔ حکمراں ریاستوں کے "غیر فانی اتحاد" نے اصولِ وفاق کو ایک نئے معنی اور نئی قدر و قیمت دے دی۔ اس اتحاد میں شریک ہونے والی ریاستیں پہلے تیرہ تھیں، اب تعداد میں اڑتالیس ہیں۔ یہ اپنی پسند کی اور خود منتخب کی ہوئی حکومتیں رکھتی ہیں، کارخانوں کی تنقیح، حفظِ صحت کا انتظام، فوج داری قانون اور اسی طرح کے دوسرے امور کی ذمے دار ہیں۔ یہ حکومتیں ایسی ہیں کہ ان میں اوسط درجے کا شہری عام طور پر شریک ہوتا رہتا ہو۔ وفاقی حکومت کو بعض مخصوص اختیارات دیے گئے ہیں۔ جیسے جنگ اور صلح، ڈاک کا انتظام، سکّہ، انتظامِ تجارت اور ایسے امور جن کے متعلق تجربے نے ثابت کر دیا ہو کہ انھیں ریاستیں اپنے طور پر اچھی طرح انجام نہیں دے سکتیں۔ مجلسِ اقوام کا اقتدار متعدد قوموں کی رضامندی پر موقوف ہو۔ لیکن اپنے قوانین نافذ کرنے میں وفاقی حکومت کے اقتدار کا انحصار ریاستوں کی رضامندی کا محتاج نہیں ہو۔ جیسا کہ جیمس میڈی سن دستور کے اصل مصنف نے کہا ہو، یہ ہر انفرادی شہری پر خود اس کے عہدے داروں اور عدالتوں کے ذریعے ایک "مکمل اور جبری عمل ہو"۔ دُوَلِ متحدہ کی کانگریس (سینٹ اور ایوانِ نمایندگان) اتحاد کے قوانین مدوّن کرتی ہو۔ رائے عامہ سے چار سال کی میقات کے لیے ایک صدر منتخب کیا جاتا ہو اور وہی قوانین کو نافذ کرتا ہو۔ ممالکِ متحدہ کی اعلا عدالت متعدد ریاستوں

کے آپس کے نزاعوں کا تصفیہ کرتی ہے۔ اسے قدیم ترین بین قومی عدالت کہا جاتا ہے۔ یہی عدالت ریاستوں اور وفاقی حکومت کے درمیان اختیارات سے متعلق متنازعہ مسائل طے کرتی ہے اور جب کانگریس اپنے دستوری اقتدار سے ہٹ کر کسی قانون کو منظور کرتی ہے تو یہ اسے منسوخ کرتی ہے۔

دُولِ متحدہ جیسے وسیع اور پیچیدہ مفاد رکھنے والے مُلک کو صرف ایک وفاقی حکومت ہی کے ماتحت متحد کیا جا سکتا ہے۔ اسی وفاقی حکومت کے ذریعے سے مُلک کا مغربی جانب پھیلاؤ روکا جا سکتا ہے۔ جب کبھی کانگریس نے کوئی ایسا قانون منظور کیا جس نے اقلیت کو نقصان پہنچایا تو اس نے وفاقی حکومت کے خلاف ریاستوں کے جذباتِ حقوق کو بھڑکایا ہے۔ اس کی ایک مثال حفاظتی محصول ہے۔ پریسیڈنٹ انڈریو جیکسن نے ۱۸۳۲ء میں اسی قسم کی ایک تحریک کو نہایت سختی کے ساتھ دبا دیا، لیکن وہ اسے بالکل فنا نہ کر سکے۔ ۱۸۶۱ء میں جب جمہوری پارٹی نے حبشی غلاموں کی تجارت کو مسدود کرنے کا عہد کیا تو اس کے لیے ابراہم لنکن کو صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ غلام رکھنے والی ریاستیں اتحاد سے علیحدہ ہو گئیں۔ ابراہم لنکن دراصل ایک سرحدی، سیدھا سادا آدمی تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک آہنی ارادے کا قائد ثابت کر دکھایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قابلِ تعریف رحم دلی اور فرزانگی کا ثبوت دیا۔ کیوں کہ غلاموں کی آزادی اور پھوٹ سے اتحاد کو بچانا اسی کی تدبیر کا نتیجہ تھا۔ اس کی وجہ سے ۱۸۶۵ء کے اتحاد کو عام اعتماد حاصل رہا۔

ایک مرتبہ جب کہ خانہ جنگی اپنے انتہائی عروج پر تھی، لنکن نے گیٹسبرگ کے میدانِ جنگ میں ایک قومی قبرستان کی تعمیر کے موقع پر

ایک مختصر سی تقریر کی تھی۔ یہ تقریر خطابت میں دنیا کے اعلا ترین شاہ کاروں میں سمجھی جاتی ہے۔ اس تقریر کا اختتام لنکن کی اس بڑی قوم کے حقیقی جذبے پر ہوتا ہے، جو بہترین طریقے سے ادا کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:۔

"یہی ہمارے لیے سب سے بہتر ہوگا کہ جو عظیم الشان کام ہمارے آگے ہے، اس پر سے قربان ہو جائیں ـــــ ان محترم جاں نثاروں نے جس مقصد کے لیے آخری اور مکمل قربانی پیش کی ہے، اس سے ہمارے مقصد میں ہمارے حوصلے اور بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں ہم مصمم عزم کرتے ہیں کہ ان مرنے والوں کی موت کو بے سوُد نہیں بنائیں گے۔ خُدا کا فضل شامل ہے تو یہ قوم آزادی کا نیا جنم لے گی اور عوام کی حکومت، عوام کے لیے، اور عوام کے ذریعے، رؤے زمین سے فنا نہ ہو سکے گی"۔

عین فتح کے موقع پر لنکن، دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور اس کے وطن نے اس کی فرزانہ و مشفقانہ قیادت سے محروم ہو کر سخت نقصان اٹھایا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو جنگ کے بعد عہدِ تعمیر کے دوران میں اس کی عالی ہمتی اور اعتدال کی روش اپنی قوم کی خدمت کے لیے ایک شریفانہ میدان بہم پہنچاتی۔ خاص کر اس وقت لنکن کی شدید ضرورت تھی، جب زمانے کا پانسا پلٹا تو جنوب کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کیا گیا۔

جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد پریسیڈنٹ ولسن کی جو حکمتِ عملی رہی ہے اس کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنا بہت ہی قبل از وقت ہوگا۔ 1919ء کی صلح کانفرنس میں اگرچہ ان کی بہت سی تجویزیں ناکام رہیں، لیکن آخر کار وہ مجلسِ اقوام کی تخلیق میں کامیاب ہو گئے۔

ٹرسٹ دولِ متحدہ کو متعدد اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بڑی بڑی تجارتی جماعتوں یا ٹرسٹوں کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ یہ جماعتیں ملک میں ہر طرف پیدا ہوگئی ہیں اور بہت بڑی حد تک اقتدار حاصل کرلیا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ دولِ متحدہ کے پاس کام یاب طور پر استعمال کرنے کے لیے عظیم الشان قدرتی ذرائع موجود ہیں۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ برِّاعظم کے وسیع رقبے کے اندر محصولِ درآمد اور پابندیوں کے بغیر تجارت کی جاسکتی ہے۔ محصولِ درآمد بڑھا دیے جانے کی وجہ سے غیر ملکی مسابقت بھی بے اثر ہوگئی ہے۔

یہ ٹرسٹ نہ صرف چھوٹے چھوٹے کاروبار اور ان قیمتوں پر جو عوام سے خرید و فروخت میں لی جاتی ہیں، ظالمانہ طور پر اپنا اقتدار استعمال کرتے ہیں بلکہ واقعتاً دولت مندوں کی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی قومی حکومت ہے جس میں صرف دولت مند شہری ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ ٹرسٹوں نے یہ اقتدار جمہوری اداروں اور خصوصاً ریاستی سیاست میں ساز باز اور رشوت کے ناجائز استعمال سے حاصل کیا ہے۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں جفاکش اور لائق صدر روزویلٹ نے ان ٹرسٹوں کے خلاف ایک سخت مہم کا آغاز کیا۔ کاروبار کو قابو میں رکھنے اور اس میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے متعدد قانون منظور کیے گئے۔ لیکن رشوت کی قوت اب بھی امریکی جمہوریت کے لیے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔

تارکانِ وطن دوسرا اہم مسئلہ غیر ملکیوں کے سیلاب کا ہے جو دولِ متحدہ میں آباد ہونے کے لیے اُمنڈا چلا آتا ہے۔ متعدد نسلوں سے یورپ سے امریکہ کو آبادی مستقل طور پر منتقل ہوتی چلی آرہی تھی۔ پہلے پہل

یہ داخلی توطن پزیری بیش تر یورپ کے شمال مغربی ملکوں سے ہو رہی تھی۔ اس طرح نئی آنے والی آبادی دولِ متحدہ میں پیدا شدہ لوگوں کی ہم نسل اور ہم زبان ہونے کی وجہ سے ان میں بغیر کسی غیر معمولی دشواری کے گھل مل گئی۔ لیکن اب ایک طرف تو مشرقی اور جنوبی یورپ سے بہت سے لوگ ایسے ہیں، اور دوسری طرف کچھ دنوں تک چین سے بھی لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ یہ نئے عناصر مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور عادات و اطوار اور معیار زندگی میں اپنے جدید وطن والوں سے بے حد اختلاف رکھتے ہیں۔ جس نواح میں یہ آباد ہوتے ہیں وہاں یہ اپنے مخصوص گروہ یا نوآبادیاں بنانا چاہتے ہیں۔ بعض رقبوں میں انھوں نے امریکی آبادی کو پوری طرح اپنے میں ضم کر لیا ہے۔ تاہم داخلی توطن اختیار کرنے والوں میں زیادہ تر اہلِ حرفہ اور کسان طبقوں کے جفاکش لوگ ہیں۔ اسی وجہ سے جن آبادیوں سے یہ لوگ آتے ہیں، اس کے سب سے زیادہ قابلِ قدر عنصر کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت مضبوط اور توانا ہے، اور یہ خود اپنی کوششوں سے اس نئے ملک میں کامیابی حاصل کرنے کے آرزو مند ہیں۔

سنہ ۱۸۲۰ء اور سنہ ۱۹۱۷ء کے درمیانی سالوں میں دولِ متحدہ میں تیس لاکھ سے زیادہ آدمی داخلی توطن پزیری کے لیے آئے، اور صرف سنہ ۱۹۱۴ء کے ایک سال میں ان کی جملہ تعداد ساڑھے بارہ لاکھ کے قریب تھی[1]۔ صاف ظاہر ہے کہ پردیسیو

---

[1] جنگِ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء۔ سنہ ۱۹۱۸ء) کے ساتھ ہی یورپ میں جو معاشی اور سماجی مصیبتیں آئیں، اس کی وجہ سے امریکہ میں حفاظتی داخلی توطن پزیری کا قانون سنہ ۱۹۲۴ء میں نافذ ہو گیا۔ اس کی رو سے درآمد کو سالانہ پندرہ لاکھ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ہر قوم کو اس میں جو حصہ دیا گیا ہے اس میں شمالی یورپ کی قوموں کے ساتھ خاص رعایت (بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰۲ پر)

کی اتنی زبردست تعداد کو ضم کرنے کا مسئلہ نہایت ضروری اور مشکل بن گیا ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے سب سے بڑھ کر ایک سنجیدہ اور مرکب نظام کی تعلیم کی ضرورت ہے جس میں ان پردیسیوں کے بچوں کو امریکہ کی زبان، تہذیب اور تصورات میں ڈھالا جا سکے۔ اس خصوص میں شاندار کام کیا جا رہا ہے۔ بیرونی دنیا کی تقریباً تمام مختلف اور متضاد نسلوں سے بہترین عناصر لے کر ایک نئی امریکی قوم کا سانچہ تیار کیا جا رہا ہے۔ "مختلف عناصر کو پگھلا کر ایک کرنے کا جو عمل یورپ میں ایک ہزار سال کی سیاسی تجاویز اور قوت کے باوجود ناکام رہا، وہ ممالک متحدہ کی جامعات اور مدارس میں خاموشی اور تیزی کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے"[۱]۔ یہ کام لوگوں کی بین قومی جماعت کی تخلیق سے انجام پا رہا ہے۔ یہ بین قومی جماعت ایک جدید بین النسلی قسم کی انسانیت پر مشتمل ہے اور اب تک اس کی تعداد دس کروڑ تک پہنچ چکی ہے[۲]۔

یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ ممالک متحدہ میں نہ صرف ایک بین قومی تمدن پیدا کیا جا رہا ہے جس کی بنیاد انگریزی زبان اور جمہوریت کی عام اطاعت پر رکھی گئی ہے، بلکہ ایک حقیقی جدید قسم کی انسانیت یعنی ایک بین النسل امریکی

(صفحہ ۲۰۱ کا بقیہ نوٹ) ملحوظ رکھی گئی ہے کیوں کہ یہی تو بین امریکی لوگوں کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

[۱] پروفیسر جے ہالینڈ روز "کانٹیم پریری ریویو" نومبر ۱۹۲۱ء

[۲] یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ طریق انضمام لاکھوں حبشیوں پر صادق نہیں آتا۔ یہ لوگ ان غلاموں کی اولاد ہیں جو خانہ جنگی سے پہلے جنوبی امریکہ کے قبضے میں تھے۔ ان ریاستوں کے سوا جہاں ان کی تعداد نسبتاً کم ہے امریکی حبشی قانون کے ماتحت نہیں بلکہ رائے عامہ اور قہر عامہ کے تحت رکھے جاتے ہیں۔ یہ جس حال میں رکھے گئے ہیں، وہ زرعی غلامی سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔

نسل بھی پھیل رہی ہے۔ "یورپ کے مختلف حصّوں سے آئے ہوئے امریکی آبادکاروں سے متعلق پروفیسر اوآس نے حال میں بہت غور و فکر کے ساتھ بعض مشاہدے کیے ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اس جدید ماحول میں بعض ناقابلِ صراحت طریقوں پر سروں کی ساخت[1] میں تغیر ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً مشرقی یورپ کے یہودیوں میں، یورپ میں پیدا ہونے والے کا سر، امریکہ میں پیدا ہونے والے کے سر سے چھوٹا اور چوڑا ہوتا ہے۔ امریکہ میں پیدا ہونے والے کی دوسری نسل میں یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپی قوموں میں اور بھی تغیرات ہو رہے ہیں۔ یہ سب تغیرات ایک مخصوص امریکی قسم کی امریکی نسل پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔" اس طرح دولِ متحدہ میں داخلی توطن سے ایک نسل پیدا ہو رہی ہے۔ اور اس کی تعمیر میں مغرب کی تمام بڑی بڑی نسلوں نے حصّہ لیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ایسا بنیادی بین قومی اور بین النسلی کام جو اتنے وسیع پیمانے اور ایسے بڑے مُلک میں انجام دیا جا رہا ہے جو قدرت کی بے اندازہ دولت سے مالا مال ہے، انسانیت کے مستقبل کو پُر امید بناتا ہے۔ دُولِ متحدہ تمام مغربی قوموں سے بہت زیادہ دولت مند، طاقت ور، اور خوش حال ہے۔ غالباً مستقبل میں وہ ماضی سے کہیں زیادہ داخلی توطن پر اثر انداز ہوگا۔ اس طرح حاصل کیے ہوئے انسانیت کے خام خمیر کو وہ ایک نئی اور متحدہ شکل میں ڈھالتا رہے گا۔ حال ہی میں شراب کی تجارت کو روکنے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ آیندہ چل کر فضیلت اور برتری کی طرف ایک زبردست قدم ثابت ہوگا۔

---

[1] سر کی ساخت عام طور پر مختلف قوموں میں فرق کرنے کے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ اقتباس مہاریٹ کی کتاب "علم الانسان" صفحہ ۵ سے لیا گیا ہے۔

یہی چیز پہلے زمانے میں ایک ناقابلِ بیان مصیبت بربادی اور ناکامی سمجھی جاتی تھی۔ پُرامن ترقی اور یورپ کی سیاسی پیچیدگیوں سے علیحدگی کی امریکی روایات اس بات کا یقین دلاتی ہیں کہ امریکی نسل کا غلبہ شہنشاہی اور جارحانہ نہ ہوگا، بلکہ بقیہ دُنیا کے لیے سوٗدمند بھی ثابت ہوگا۔

اس طرح تاریخ جدید کے اس اہم ترین مسئلے یعنی بدامنی اور جارحانہ قومیت کو قابو میں رکھنے کے مسئلے کا ہم نے مختصر سا جائزہ لے لیا ہے۔ ہم نے بعض ایسی تجویزوں پر بھی غور کیا ہے جو گزشتہ زمانے میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ناکام طور پر استعمال کی گئی تھیں۔ ہم نے زیادہ تفصیل کے ساتھ تین امید افزا جدید حل معلوم کیے ہیں ــــــ مجلسِ اقوام، "قوموں کا خاندان" اور ایک جدید بین قومی قوم۔

اب ہمیں اور دوسرے عوامل کی طرف توجّہ کرنی چاہیے جو دورِ حاضرہ کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

نواں باب

یونانِ قدیم کا احیا اور نئی تحریکیں

نشاۃِ ثانیہ ۱۴۵۳ء میں جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کر لیا تو یونانی عالموں کی ایک بڑی تعداد نے بھاگ کر یورپ کے مغربی علاقوں میں پناہ لی۔ یہ اپنے ساتھ بیش بہا قدیم مخطوطے بھی لیتے گئے تھے۔

لیکن اس سے بہت پہلے ہی سے خاص طور پر اطالیہ میں قدیم یونانی اور رومی تہذیب سے بڑی گہری دل چسپی لی جا رہی تھی۔ آرٹ اور ادب کو ترقی دینے اور انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ مہذب اور پر تکلف بنانے کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ یونانی عالموں کی آمد نے اس تحریک میں جو "ہیومنزم" یا مسلک انسانیت بھی کہلاتی ہے، بڑی جان ڈال دی[۱]۔ دنیائے قدیم کی حکمت، شاعری اور فنونِ لطیفہ، مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ تصورات کا مطالعہ اور ان کی نقل بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کی جانے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاگیری نظام کے طویل طویل زمانوں کی موت کے بعد تہذیب و تمدن نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ درخشاں دور "حیاتِ نو" یا نشاۃِ ثانیہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔

اس نشاۃِ ثانیہ میں ایک حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت ہر طرف پھوٹ پڑی تھی۔ بیسیوں مشہور مصوروں میں رافیل اور مائکیل انجلو، اور بیسیوں سائنس دانوں میں لیونارڈو ڈاونسی سب سے زیادہ نام ور تھے۔ اس عہد کے بہت سے بڑے بڑے عالموں میں ہالینڈ نے اراسمس کی ذات میں سب سے بڑا عالم اور بڑے بڑے شاعروں میں انگلستان نے شکسپیر کی ذات میں سب سے بڑا شاعر پیدا کیا۔ شکسپیر صحیح معنی میں نشاۃِ ثانیہ ہی سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ ایک صدی بعد نشاۃِ ثانیہ کا اثر اطالیہ سے زیادہ انگلستان پر پڑا۔

لیکن اگر پندرھویں صدی کے وسط میں چھاپے خانے کی ایجاد نہ ہو گئی ہوتی تو نشاۃِ ثانیہ کا عمل ناممکن ہو جاتا۔ اس ایجاد نے جدید قدیم علوم کی نشر و

---

[۱] دورِ جدید کے بعض مورخ کہتے ہیں کہ یونانی علوم کی تحصیل کا شوق اطالیہ میں پہلے ہی سے موجود تھا اور قسطنطنیہ کی فتح سے اس میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

اشاعت میں زبردست حصہ لیا ہے اور بعد میں اس عالمگیر تعلیمی توسیع کو ممکن بنا دیا ہے جو انسانیت کی ترقی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اطالوی نشاۃِ ثانیہ میں یہی نہیں کہ قدیم فنون اور تفکر کی طرف ازسرِنو توجہ کی گئی۔ بلکہ یہ قرونِ وسطیٰ کی ہر چیز کے خلاف، نظامِ جاگیری، جہالت اور رہبانیت کے خلاف حتیٰ کہ اخلاقی روک تھام بلکہ خود عیسائیت کے خلاف ایک زبردست بغاوت تھی۔ اسی وجہ سے اس میں فرض اور کردار کے اعلا تصورات کا فقدان پایا جاتا تھا، اور شرمناک عیاشی، بدکاری اور اوباشی کی طرف رجحان ہو گیا تھا۔ سیاسی طور پر اس کا اظہار جمہوریت کے احیا کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ اس ظالم کے قالب میں جنم لیا جو ہر خدائی اور انسانی قانون سے بالاتر ہے اور جس کی جھلک میکیاولی کی کتاب "پرنس" میں نظر آتی ہے۔ پاپائی نظام، جس نے روما میں نشاۃِ ثانیہ کی تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے میں بڑا حصہ لیا تھا، اور اس طرح مصوری اور فنِ تعمیر کے کارناموں کے ذریعے سے شہر روما کو شہرۂ آفاق بنا دیا تھا، وہ بھی عیاشی اور بدکاری کے گڑھے میں جا پڑا۔ پوپ اپنے ذاتی اغراض اور دنیوی مقاصد کے لیے اس روحانی فضیلت اور اقتدار کو صرف کرنے لگا جو رومی کلیسا کو یورپی عوام کے دلوں پر حاصل تھا۔ ایک نئی بیداری کا وقت آ چکا تھا۔ یونان کے فنون اور یونان کے حسن کا تصور پھر سے زندہ ہو گیا تھا اس کی شدید ضرورت تھی کہ یونانی تہذیب کی گہرائیوں پر بھی نظر کی جاتی۔

اصلاح پاپائی نظام کے انحلال نے اوّلاً سخت نکتہ چینی اور بے پناہ استہزا کے دروازے کھول دیے۔ فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور انگلستان میں روشن خیال لوگوں کی زبردست جماعت کلیسا میں اصلاح کا

مطالبہ کر رہی تھی، اراس مس اس کا لیڈر بن گیا۔ ان ملکوں میں بھی قدیم علوم کی اشاعت کا احیا ہو رہا تھا اور لوگوں کو خود اپنے طور پر سوچنے، حکومتی اقتدار پر تنقید کرنے اور خواہش آزادی کا اظہار کرنے کی تعلیم دی جارہی تھی۔ اطالیہ کی بہ نسبت شمالی یورپ زیادہ سنجیدہ، زیادہ با اخلاق اور کم جوشیلا اور فنونِ لطیفہ سے کم مس رکھتا تھا۔ خصوصاً جرمنی میں ایک وسیع اور عمیق اخلاقی جذبہ پایا جاتا تھا اور یہاں بد اخلاقی کا استیصال اور نیکی کے قیام کا عزم پیدا ہو گیا تھا۔ جان ہس[1] نامی ایک شہید ولی نے خاص طور پر لوگوں کو اس مطالبے پر مُصر کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات۔ یعنی اخوت مساوات اور خدا پر اعتماد کے مذہب کی طرف واپس جانا چاہیے جو کیتھولک کلیسا کے اضافہ کیے ہوئے عقائد سے پاک ہو۔

اس طرح جرمنی میں ایک حقیقی مُصلح مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء سے ۱۵۴۶ء) کی آمد کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ پاپائی نظام پر حملہ کرنے میں یہ اراس مس سے بھی بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ اس نے نہایت جرأت کے ساتھ کلیسا اور شہنشاہ کی تمام قوتوں کے مقابلے میں مطالبہ کیا کہ اصلاح پسند جماعت رُومی کیتھولک نظام سے اپنے آپ کو بالکل علاحدہ کر لے۔ لوتھر کی تحریک کا جرمنی کے بہت سے سرکش رئیسوں اور جاگیری امیروں نے شوق سے خیر مقدم کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس نئی پراٹسٹنٹ تحریک کے ذریعے سے شہنشاہ کے مقابلے میں اپنے

---

[1] جان ہس ایک زیرک عالم تھا۔ چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کی ابتدا میں یہ شخص پراگ کے مقام پر تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس کو کلیسائی حقوق سے محروم کیا گیا، اور ۱۴۱۵ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ اس نے اپنے بیش تر خیالات چودھویں صدی کے ایک انگریز مصلح جان وی کلف سے حاصل کیے تھے۔

اقتدار کو بڑھانے کا ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لوتھر ایک زبردست مذہبی پیشوا تھا، لیکن تنظیم سے وہ واقف نہ تھا۔ لوتھر نے اس نئے کلیسا کے (یہ کلیسا اسی کے نام سے موسوم ہے) بیشتر اختیارات قومی یا ریاستی کلیسا کے صدر کی حیثیت سے رئیس یا بادشاہ کو دے دیے۔ اس طرح لوتھر کے نظام میں مذہب سیاسیات کا تابع ہو گیا۔ لیکن سوئزرلینڈ میں پروٹسٹنٹ نظام کی ایک دوسری صورت نے استحکام حاصل کر لیا، اور جان کال ون (۱۵۰۹ء۔ ۱۵۴۶ء) نامی ایک فرانسیسی شخص نے اس کو منظم کیا اور اس کی بنیاد جمہوری اور نمایندہ کلیسائی حکومت پر رکھی۔ کال وینی نظام بڑی تیزی کے ساتھ فرانس میں پھیل گیا۔ فرانس میں بھی جرمنی کی طرح یہ نئی تحریک کچھ عرصے تک جاگیری نظام کے امیروں کو مرکزی حکومت کے خلاف تقویت پہنچاتی رہی۔ رفتہ رفتہ کال وینی نظام اسکاٹ لینڈ اور شمالی ندرلینڈ کی مخصوص عیسائیت بن گیا۔

انگلستان میں ہنری ہشتم نے اپنی اسپینی ملکہ سے طلاق حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے پوپ کو آمادہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس پر ہنری نے انگریزی کلیسا کو روما سے علیحدہ کر دیا، اور خود اس کا صدر بن بیٹھا۔ اس نے خانقاہوں کو بند کر دیا؛ اور کلیسا کی بہت سی جایداد ضبط کر لی اور اس کا صرف ایک حصہ مدرسوں کے قیام اور بحریہ کی تعمیر میں صرف کیا۔ انگلستان کو کم از کم کچھ عرصے کے لیے خانقاہوں کے بند کرنے سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔ زمینوں کے نئے مالک جنھوں نے بادشاہ سے کلیسا کی زمین خریدی تھی، بڑے لٹیرے اور ظالم تھے۔ انھوں نے اپنی جایداد کے بڑے حصے کو زرعی زمین سے چراگاہ میں تبدیل کر کے بہت سے مزدوروں کو بے کار کر دیا۔ انھوں نے

دیہات کی مشترکہ عام زمینوں پر قبضہ کرکے انھیں محصور کرلیا۔ اس طرح ان لوگوں نے افلاس اور فلاکت پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا اور انگلستان "ہٹے کٹے بھکاریوں" سے بھر گیا۔ یہ لوگ سخت سے سخت محنت کا کام کرنے کے قابل تھے لیکن کام حاصل کرنے کے ناقابل تھے۔ پچھلے زمانے میں خانقاہیں غریبوں میں بے حساب خیرات بانٹا کرتی تھیں، لیکن اب یہ ذریعہ معاش بند ہو چکا تھا۔

اس طرح بہت دنوں تک انگلستان میں تحریکِ اصلاح نامقبول رہی اور اس کے خلاف عام طور پر مسلسل بغاوت ہوتی رہی۔

جوابی اصلاح شہنشاہ چارلس پنجم (۱۵۱۹ء۔ ۱۵۵۶ء) نے اصلاح کی سختی کے ساتھ مخالفت کی اور اس کی وفات سے پہلے خود رومی کلیسا کے اندر ایک نئی تحریک پیدا ہوگئی۔ اس تحریک نے اصلاح کے کام کو روک دیا اور اس کو بے اثر کرکے یورپ کو رومن کیتھولک پروٹسٹنٹ فرقوں میں منقسم کردیا۔ یہ دونوں فرقے آپس میں شدید مخاصمت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ یہ تحریک "جوابی اصلاح" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رومی کلیسا کو بدنام کرنے والی اندرونی خرابیوں سے پاک کرکے اس کو مزید پروٹسٹنٹ حملوں کے مقابلے میں مستحکم بنا دیا جائے۔

اس جوابی اصلاح سے کلیسا کی بہت سی خرابیاں دور ہوگئیں۔ پاپائی نظام، جو اطالوی نشاۃِ ثانیہ میں دنیا دار اور ریاکارانہ تھا، اب سنجیدہ اور بااخلاق ہوگیا۔ اسی زمانے میں جسوئٹس کا زبردست مذہبی نظام قائم کیا گیا۔ جسوئٹوں کی یہ جماعت کلیسا کی اعلا تربیت یافتہ لیکن غیر مسلح

فوج بن گئی۔ لوگ اس کے مقصد کے حصول کے لیے افلاس کا حلف اٹھاتے اور ایک آہنی نظم کے ماتحت کامل فرماں برداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے تھے۔ جسوِرسٹوں نے رومن کیتھولک سیحیت کے پیغام اور نظم کو دُور دُور تک جدید دریافت شدہ برِاعظموں اور مُلکوں میں مشرق سے مغرب تک پہنچا دیا۔ یورپ کے ایسے مُلک جو پراٹسٹنٹ ہو گئے تھے، ان میں کلیسا کی حیثیت کو پھر قائم کرنے، اور ایسے مُلک جو ابھی تک زیادہ تر کیتھولک ہی تھے، انھیں محفوظ رکھنے کے لیے ہر قسم کی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔

یورپی رومن کیتھولک دُنیا کے طول و عرض میں مذہبی عدالتیں قائم کی گئیں اور پراوٹسٹنٹ نظام کی بیخ کنی کرنے میں اذیت رسانی اور زندہ جلا دینے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ یہ عدالتیں مختصر علاقوں میں وسیع اختیارات کے ساتھ قائم کی گئی تھیں کہ رومن کیتھولک نظام کے سوا تمام دوسرے مذہبوں کا استیصال کر دیا جائے۔

اسپین کے زبردست کیتھولک شاہی خاندان کا بادشاہ اپنے آپ کو کلیسا کا ایک ادنا خادم تصور کرتا تھا۔ یہ خاندان کلیسا کے مقاصد کے لیے امریکہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے کے لیے بے شمار ذرائع بڑی فیّاضی کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔

کچھ عرصے کے لیے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروٹسٹنٹ نظام بہ زورِ قوت فنا کر دیا جانے والا ہے۔ لیکن اسپینی غاصبوں کے خلاف نادرلینڈ کے لوگوں کی مردانہ وار بغاوت اور انگریزوں کے مقابلے میں اسپینی آرمیڈا کی شکست نے ان مذاہب کے درمیان ایک توازن قائم کر دیا، جو سترھویں صدی تک باقی رہا۔ تیس سالہ جنگ میں کیتھولک نظام کی ناکامیوں اور لوئی چہار دہم کے

ماتحت اس کی کام یابیوں کے باوجود یہ توازن برابر برقرار رہا۔ لوئی اپنے آپ کو نہ صرف فرانسیسی قومیت بلکہ کیتھولک عیسائیت کا بھی ایک زبردست حامی سمجھتا تھا۔

آخر کار اٹھارھویں صدی میں مقبولیت اور مذہبی رواداری کی رُوح کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قومی جنگوں میں یورپ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور سمندر پار کی نوآبادیاتی و تجارتی کاروبار کی توسیع نے تلخ مذہبی رقابت اور کیتھولک اور پراٹسٹنٹ فرقوں کی باہمی نزاع کا خاتمہ کردیا۔

نشاۃِ ثانیہ اور اصلاح کا اثر

اطالیہ میں قدیم علوم کے از سرِ نو احیا میں صرف یہی نہیں کیا کہ یونانی فنونِ لطیفہ اور یونانی ادب میں دوبارہ جان ڈال دی بلکہ اس سے بڑھ کر کام اس نے یونان کی آزادانہ تحقیق اور آزادانہ تنقید کو بھی زندہ کردیا، جو انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر کارنامے پر حاوی تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انسان کی تمام فطری خوبیوں کی فراخ دلی اور روشن خیالی کے ساتھ تربیت دی جائے تاکہ انسان کے وجود کا ہر رُخ اپنی انتہائی قابلیت تک ترقی کرجائے۔ اور شہری کو اپنی تمام جسمانی اور دماغی قوتوں کو انتہائی مفید بنانا سکھایا جائے۔ اس طرح اطالوی نشاۃِ ثانیہ میں آزادیٔ خیال کا یونانی جذبہ پھر ایک بار زندہ ہوگیا۔ لوگوں کو وہی تعلیم دی جانے لگی جو دو ہزار سال پہلے سقراط نے دی تھی۔ یعنی آزاد تفکر اور کسی اعلا اقتدار یا تفضل یا تقدس کے دعوے کو بلا دلیل نہ تسلیم کرنا بلکہ تمام اشیا کی تہ تک روشن خیالی اور تعمیری تنقید سے جانچنا۔

دوسری طرف شمال میں مذہبی اصلاح کا یہ مفہوم تھا کہ یہ خیال اور تنقید میں آزادی کی نئی روح (جو اطالیہ میں خود غرضی کی طرف لیے جارہی

تھی، انتہائی اخلاقی شغف کے ساتھ مذہبی آزادی اور روحانی صداقت کی طرف رہنمائی کرے جو انفرادی زندگی کے اغراض سے بالاتر ہو۔ اس کے بعد کی مذہبی لڑائیاں خوف ناک اور خوں ریز ہونے کے باوجود کم از کم یہ تو ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کسی چیز پر جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں اس پر سے اپنی ہر چیز قربان کرکے اس کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔

اصلاح نے سب سے زیادہ نمایاں کام جو انجام دیا ہے وہ ضمیر کی آزادی کے سلسلے میں آزادی کی یونانی اسپرٹ کا زندہ کرنا ہے۔ پاپائی نظام کی بدکاریوں کے خلاف لوتھر کے غیظ و غضب اور اس کا بے خوف دعوا کہ اسے اپنے طریقے پر خدا کی عبادت کرنے کا حق حاصل ہے، گویا سقراط ہی کی صدائے بازگشت تھی جو ایتھنز کے ججوں کے آگے تلاشِ حق سے دست بردار ہونے کے مقابلے میں اپنی موت کو ترجیح دے رہا ہے اور ان پر ظاہر کر رہا ہے کہ بندوں کی نہیں بلکہ خدا کی اطاعت کرنی چاہیے۔

پروٹسٹنٹ نظام کے بڑے بڑے انقلابی رہ نما یعنی ہالینڈ میں ولیم دی سائیلنٹ (صفحہ کا حاشیہ دیکھیے) اور انگلستان میں آلیور کرامول اس اعتبار سے لوتھر سے بھی زیادہ دور اندیش نکلے۔ ان کے ہم عصروں میں رواداری کا فقدان ہونے کے باوجود انھوں نے نہ صرف اپنا اور اپنے ہم خیال لوگوں کا حق منوایا کہ وہ اپنے طریقے پر خدا کی عبادت کرسکتے ہیں، بلکہ ان لوگوں کا بھی حق تسلیم کیا جن کے خیالات ان کے خلاف تھے۔ اس طرح انھوں نے حقیقی مذہبی رواداری کا اصول قائم کردیا۔

دریافت یونانی علوم کے احیا کے ساتھ ساتھ دنیا کے متعلق انسانی زاویۂ نظر میں وسعت پیدا کرنے کے کام میں ایک دوسری زبردست

قوت اپنا کام کر رہی تھی۔ یہ قوت اس بات کا انکشاف تھا کہ دنیا اس سے بہت زیادہ بڑی اور اس سے بہت زیادہ دل چسپ مقام ہے جتنی کہ وہ اب تک سمجھی جاتی تھی۔

تیرھویں صدی کے اختتام پر مارکوپولو نامی وینس کے ایک تاجر نے چین کا ایک دلیرانہ سفر کیا۔ یہاں وہ شہنشاہِ چین کی خدمت میں بیس سال تک ایک اہم خدمت پر مامور رہا۔ واپسی کے بحری سفر میں اس نے ہندستان کی بندرگاہوں اور مشرق کے دوسرے مقاموں کی سیر کی۔ اس نے اپنی مہمات سے متعلق جو کتاب لکھی وہ پورے یورپ میں انتہائی دل چسپی کے ساتھ پڑھی گئی۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں ترکوں کی فتوحات ان قدیم بری راستوں کو بند کر رہی تھیں جن کے ذریعے سے ایشیا اور یورپ میں تجارت ہوتی تھی۔ نئے راستے دریافت کرنے کی کوشش میں پرتگالی ملاح اپنے تحقیقاتی بحری سفر جنوب میں ساحلِ افریقہ کے کنارے کنارے بڑھتے جا رہے تھے۔ آخرکار ۱۴۸۶ء میں ڈیاز راس امید تک پہنچ گیا۔ اور اس کے چند سال بعد ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما ہندستان کے جنوب مغربی ساحل پر کالی کٹ جا پہنچا۔ اس وقت سے مشرق میں دریافت کا سلسلہ اور آگے بڑھتا ہی گیا۔

۱۴۹۲ء میں مسلمان موروں کا آخری قلعہ غرناطہ فتح کرنے کے بعد اسپینی حکومت مستحکم ہو گئی تھی۔ اسی سال کرسٹوفر کولمبس نامی ایک جینوزی ملاح جو شاہ اسپین کا ملازم بھی تھا، تین چھوٹے جہاز لے کر سمندر میں مغرب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سفر سے اس کا مقصد ہندستان کا ایک مغربی راستہ دریافت کرنا تھا۔ تاکہ اس کے ذریعے سے اسپینی بادشاہ مشرق کی دولت بخش تجارت سے

فائدہ اٹھاسکیں۔ اس زمانے میں لوگوں کو حال ہی میں معلوم ہوا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور ابھی تک ان کا بھی خیال تھا کہ اس کے قطر کا فاصلہ حقیقی فاصلے سے بہت ہی کم ہے۔

بہت سی مایوسیوں اور واپسی کے لیے اپنے ملاحوں کے عذر کی دھمکیوں کے باوجود آخر کار کولمبس جزائر غرب الہند تک پہنچ ہی گیا۔ ان جزائر کو کولمبس نے چین کے ساحلی جزیرے سمجھے۔ کیوبا اور ہیٹی کے جزیرے دریافت کرنے کے بعد وہ اسپین واپس ہوا لیکن دوسرے سال پھر وہ اپنے سفر پر روانہ ہوا، اور کئی جزیرے دریافت کیے، اور چند سال بعد جنوبی امریکہ کے ساحل کا ایک حصہ دریافت کرلیا۔

سولھویں صدی کے اوائل میں پال بوا نامی ایک اسپینی پناما کی کھاڑی پار کر کے بحر اوقیانوس میں پہنچ گیا۔ اس کے چھ سال بعد میاگے لان نے دنیا کے اطراف کا پہلا بحری سفر کیا۔ اسی زمانے میں مکسکو کی امریکی ہندی سلطنت کو کارٹز نے اسپین کے لیے فتح کرلیا۔ ۱۵۳۱ء میں پی زارو، پیرو پہنچا جہاں قیمتی دھاتیں اتنی عام تھیں کہ "سونا چاندی بھی تنہا ایسی چیزیں معلوم ہوتی تھیں کہ ان کو دولت میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا" یہاں کی پیرودین قوم کافی متمدن تھی، اور زراعت، آب پاشی اور تعمیرات میں بڑی مہارت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کی حکومت استبدادی مگر دراصل بہت ہی خیراندیش تھی۔ ولادت سے لے کر وفات تک رعایا کی زندگی کے ہر شعبے میں باقاعدگی اور نظم پیدا کیا گیا تھا۔ ان میں ذات بندی کا ایک سخت نظام بھی رائج تھا۔ جس کی رو سے کوئی شخص اس ذات سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ حکومت ہر شہری کا کام، اس کی تعطیلات، اس کی غذا، اس کے کپڑے

اس کی قیام گاہ، اور یہاں تک کہ اس کی شادی اور تقریب تک کا انتظام کرتی تھی۔ پیرو کے ہر باشندے کو حکومت کی طرف سے ایک مکان اور اتنی زمین ملتی تھی جو اسے اور اس کے خاندان کو فلاکت سے محفوظ رکھ سکے۔

" فتوحات کے ذریعے سے سلطنت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مگر یہ قاعدہ کبھی بدلا نہیں جاتا تھا کہ مفتوح قبیلوں کو پورے شہری حقوق دیے جاتے تھے۔ انھیں ہر طرح ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ سکونت اختیار کریں اور اپنے نئے آقاؤں کی وفادار رعایا بن جائیں۔"

پیزارو نے اس زبردست اور انتہائی منظم سلطنت پر ۱۶۸ آدمیوں کی ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ حملہ کیا اور اُسے زیر کر لیا۔ اس کا یہ حملہ دُنیا کی تمام تاریخی معرکہ آرائیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔

اہلِ اسپین نے اپنے وسیع مفتوحہ علاقوں پر بہت بُری طرح حکومت کی۔ ان ملکوں کے باشندوں کو غلام بنایا اور ان کی ساری دولت لوٹ لی۔ سترھویں صدی تک یہی حال رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں نے نیو انگلینڈ میں اور فرانسیسیوں نے کنیڈا میں حقیقی نوآبادیاتی بستیاں قائم کیں۔ آبادکاروں نے ان کا ابتدائی کام نہایت جاں فشانی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ نوآبادیاں دولت مند بھی ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ان کی دولت لوٹ کھسوٹ کا نہیں بلکہ ان کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انگلستان کی امریکی نوآبادیوں کا دار و مدار غلاموں کی محنت اور مشقت پر تھا۔ ان حبشیوں کو افریقہ میں ان کے گھروں سے پکڑا جاتا تھا۔ پھر انھیں وحشیانہ اور ظالمانہ شرائط کے ماتحت جہازوں میں لادتے اور بحرِ اوقیانوس پار کر کے امریکہ میں فروخت کر ڈالتے تھے۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کی ابتدا تک جاری رہا۔ اور اس کا خاتمہ زیادہ تر

ولیم ولبر فورس جیسے زبردست ہمدردِ خلائق کی کوششوں سے ہوا۔[1]

دریافت کا یہ سلسلہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی تک جاری رہا۔ سترھویں صدی میں روسی، سائبریا کے اطراف سے بحرِ منجمد شمالی میں گھس پڑے اور اٹھارھویں صدی میں کک نامی ایک عالی ہمت انگریز ملاح نے سواحلِ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، شمالی مغربی امریکہ اور بحرِ منجمد کے بہت سے جزیروں کی پیمایش کر ڈالی۔

انیسویں صدی کے دوران میں بہت سے من چلے بہادروں نے افریقہ کے اندرونی علاقوں کی دریافت میں حصہ لیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ڈیوڈ لیونگ اسٹون نامی ایک شخص ہے۔ یہ حبشی قوم کا بڑا دوست اور ہمدرد تھا۔ اور اس نے حبشی قوم کے تمام دشمنوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پیری نامی ایک امریکی دریافت کنندہ قطبِ شمالی پر پہنچ گیا اور ناروے کا باشندہ امنڈسن اور اسکاٹ نامی انگریز قطبِ جنوبی پر پہنچے۔ آخرالذکر کو کامیابی کے ساتھ ساتھ اپنی جان بھی دینی پڑی۔ واپسی کے سفر میں محفوظ خطے تک پہنچنے کے لیے صرف گیارہ میل رہ گئے تھے کہ سردی کی شدت نے اس کی جان لے لی۔

اس طرح تاریخ کے دورِ جدید کے مخصوص خط و خال میں سے ایک اہم ترین خصوصیت "توسیعِ یورپ" یعنی دریافت، تجارت، اور آبادکاری کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں یورپی تہذیب و تمدن اور اقتدار کو پھیلانا ہے۔ یہ پوری تحریک ایک وسیع پیمانے پر آغازِ تاریخ کے وقت کی اس تاریخ سے مشابہ

---

[1] سلطنتِ برطانیہ میں ۱۸۳۳ء میں بردہ فروشی ممنوع قرار دی گئی۔ انسانیت کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اس وقت سے یہ بری رسم افریقہ کے اندرونی حصوں اور خصوصاً حبش کو چھوڑ کر ہر جگہ ختم ہو چکی ہے۔

ہے جس نے یونانی تمدن، آبادکاری اور اقتدار کے جذبے کو اکسایا تھا۔ موجودہ تحریک میں بھی مہمات پسندی کی وہی روح کارفرما ہے۔ اور دریافت، تجارت اور آبادکاری کے وہی محرکات اپنا کام کر رہے ہیں جو کسی وقت بحرِ روم کی قدیم دُنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنا اثر دکھا رہے تھے۔

سائنس

نشاۃِ ثانیہ میں یونانی علوم کے احیا نے اشیا کی ماہیت اور ان کے اسباب و علل کی آزادانہ یونانی طریقۂ دریافت کی روایتوں کو پھر زندہ کر دیا۔

قرونِ وسطیٰ میں ان مقامات کے سوا جہاں روشن خیال عرب مفکروں کے اثر نے خود اس کو محسوس کرایا تھا، کلیسا کے اقتدار نے کچھ تو عام جہالت اور کوتاہ بینی اور کچھ تنقید سے بالا قدیم نظریوں کے تحکمانہ استعمال سے سائنٹفک خیال کو کچل ڈالا تھا۔ لوگ جب مظاہرِ قدرت کا مطالعہ کرتے تو حقائق کے مشاہدے کی راہ میں یہ سب شکلیں آکھڑی ہوتی تھیں۔

لیکن نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ ہی کلیسا اور روایتی نظریوں کے اقتدار کو دعوتِ مقابلہ دی جانے لگی۔ پھر ایک بار لوگوں میں یونانیوں کی طرح حقیقت کی تہ تک پہنچنے، حقائق کو جا پہنچنے، تفصیلات کی صحیح تفتیش و تحقیق اور تقابل اور عملی تجربوں کے ذریعے تکمیلِ علم کا شوق پیدا ہو گیا۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ کے فلسفیوں میں اس بارے میں کبھی نہ ختم ہونے والی بحثیں ہوتی رہیں کہ اپنے وزن کے لحاظ سے اجسام جلد یا دیر سے کیوں گرتے ہیں۔ اس کو اصولِ موضوعہ کے طور پر مان لیا گیا تھا کہ یہ بس یوں ہی گرتے ہیں۔ جب نشاۃِ ثانیہ نے سائنٹفک روح میں ایک حقیقی بیداری پیدا کر دی تو اس مسئلے کا تصفیہ ہو گیا۔ گیلی لیو، پی سا کے برج پر چڑھا اور اس پر سے اس نے دو غیر مساوی وزن کی چیزیں

گرائیں، دونوں ایک ہی وقت میں زمین پر پہنچیں۔ وہ مسئلہ جو نظریہ سازوں کے پاس اتنا زیرِ بحث تھا اور جس کی بنیاد از سرتاپا اتنی غلط رکھی گئی تھی، ایک سائنس داں کے معمولی سے تجربے سے ہمیشہ کے لیے طے ہو گیا۔

قرونِ وسطیٰ میں سائنٹی فک روح پیدا کرنے میں راجر بیکن انگریز کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے جو تیرھویں صدی میں گزرا ہے۔ اس کو عملی تجربوں پر بڑا اصرار تھا۔ اس نے دخانی جہازوں اور طیاروں کے متعلق بھی غور کیا تھا، اور بارود کے متعلق تجربے کیے تھے۔ مگر کلیسا نے اس کو اپنے آزادانہ ذاتی تجربوں کی بنا پر بدعتی قرار دے کر قید کر دیا۔ اس کی وجہ تھی کہ کلیسا اپنے آپ کو سارے علم کا سرچشمہ تصوّر کرتا تھا۔

پندرھویں صدی کے اختتام پر اطالوی نشاۃ ثانیہ کے سائنس دانوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر لیونارڈو ڈاونسی تھا۔ ایک نہایت ہی ماہر مصوّر ہونے کے علاوہ اس نے طبیعی تاریخ اور علمِ تشریح الابدان کے متعلق نہایت صحیح مشاہدے کیے تھے۔ اس نے رِکاز کی اصلی ماہیت دریافت کی تھی۔ اور ایک قابل انجنیر بھی بن گیا تھا۔

قریب قریب اسی زمانے میں کوپرنی کس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے بعد گیلی لیو نے دوربین ایجاد کی، اور اس کے ذریعے سے سورج کے دھبے اور مشتری کے چاند دریافت کیے۔ کائنات کی ماہیت اور نظامِ شمسی کی وسعت کے متعلق ایسی اور اسی قسم کی دریافتوں نے ذہنِ انسانی کو وسیع کرنے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ انسان اب اپنے آپ کو زمانۂ قدیم کی طرح ایک ایسی دنیا کے باشندے نہیں سمجھتے تھے جو ہر چیز کا مرکز ہے اور نہ وہ یہ سوچتے تھے کہ تارے خاص طور پر ان کی سہولت اور آرام کے لیے

مہیا کیے گئے ہیں۔

سترھویں صدی کے اوائل میں فرانسیس بیکن نے سائنٹی فک تحقیق کے قواعد مدوّن کیے۔ اس نے صحیح اور تفصیلی مطالعہ اور محتاط عملی تجربے کی بنیادی اہمیت پر بہت زور دیا۔ "تمام نظریوں اور عام قیاسوں کو دُور کردو، اور اپنی سمجھ سے کام لو، اس طرح سب سے پاک اور الگ ہونے کے بعد تفصیلات کا بالکل نئے سرے سے جائزہ لو۔" اسی طرح بیکن کے ان اصولوں کو جنھیں اس کے ہم نام نے اس سے ساڑھے تین سو سال قبل مرتب کیا تھا، منضبط کرکے انھیں جاری کیا۔

اس وقت سے اب تک سائنٹی فک دُور بینی اور اس کی فتوحات کا سلسلہ کبھی بند ہونے نہیں پایا۔ سترھویں صدی کے وسط میں سائنٹی فک حقائق کے مطالعے کے لیے انگلستان میں رائل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی سرپرستی میں نئے نئے انکشافات اور فطری قوانین کی تدوین کا کام مستقل طور پر آگے بڑھتا گیا۔ اس صدی کے اختتام پر ایزک نیوٹن نے کشش ثقل کے کلیے اور سائنٹی فک مسائل کے حل کرنے کے لیے جدید ریاضیاتی قاعدے دریافت کیے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں سائنس کو صنعت و حرفت میں عملی طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت و حرفت میں نہایت وسیع اور دُوررس تغیرات رُونما ہونے لگے۔

پہلے پہل مشینیں سوتی اور اونی سامان کی صنعت کو بڑھانے کے لیے استعمال کی گئیں، اور اس کے بعد ہر قسم کی صنعتوں میں استعمال ہونے لگیں جیمس ویاٹ نے دخانی انجن کو ترقی دے کر اسے قوت کا ایک ذریعہ بنا دیا، اور

اس سے صنعتی دنیا کی حالت میں بڑا زبردست انقلاب پیدا ہو گیا۔ پہلے پہل اس کو کارخانوں میں مشینوں کے چلانے میں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد یہ دخانی جہازوں کو چلانے اور ریلوں کو کھینچنے میں استعمال ہونے لگا۔

فرانس کے مشہور عالم ڈیڈی راٹ کی مشہور انسائیکلو پیڈیا ۱۷۵۲ء میں شائع ہونی شروع ہو گئی۔ اس میں سائنس کے کارنامے، سائنٹی فک خیالات اور اس تاریخ تک کی صنعت و حرفت کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔ اس نے سیاسی اصلاح کے ساتھ ساتھ سائنٹی فک اور صنعتی کاروبار کو بڑی تقویت بخشی۔

نظامِ کارخانہ داری جدید کارخانوں نے سابقہ گھریلو صنعت و حرفت کے نظام کو تقریباً پوری طرح بٹھا دیا۔ اس کے متعلق ڈی فو نے اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں لکھا تھا:۔

"انگلستان کے ایک شمالی ضلع کے ہر ایک بڑے گھر میں ایک ایک کارخانہ ہوتا تھا۔ تمام گھر محنتی اشخاص سے بھرے ہوتے تھے۔ کچھ آدمی رنگ کے حوضوں پر کام کرتے تھے۔ کچھ کرگھے کا کام دیکھتے تھے اور کچھ کلف دیتے تھے۔ عورتیں اور بچے روئی دھنکنے، کپڑا سینے میں لگائے جاتے تھے۔ غرض چھوٹے بڑے سب ہی مزدوری کرتے تھے۔ جس کی عمر چار سال سے زیادہ ہو جاتی اس کو اپنی روزی آپ کمانے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ نہ کوئی بھکاری نظر آتا تھا، نہ کوئی بے کار۔ عام طور پر لوگوں کی عمر زیادہ ہوتی تھی۔ ان کو اچھی ہوا ملتی تھی۔ ان حالات میں سخت محنت کا نتیجہ اگر دولت نہ بھی ہوتا تو صحت مندی ضرور ہوتا تھا۔"

ان صحت مند گھریلو صنعتوں کی جگہ اب بڑے بڑے صنعتی شہر پیدا ہو گئے

لگے۔ ان شہروں میں ہر طرف ملبیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس لیے صنعتی شہروں کی طرف صنعتی آبادی کا تانتا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی کا ماحول بہت ہی بگڑ گیا۔ لوگ جانوروں کے گلوں کی طرح غلاظت اور بیماری کے درمیان بڑی تنگی سے بسر کرتے ہیں۔ ان کو بہت دیر تک حقیر معاوضے کے لیے بہت ہی غیر صحت بخش ماحول میں کام کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں اور بچوں سے کارخانوں اور کانوں میں اس طرح کام لیا جاتا ہے جو غلاموں سے کم نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کارخانہ داری نے صنعتی پیداوار میں زبردست اضافہ کر دیا۔ کارخانے کے مالکوں کے ہاتھ میں کثیر دولت دے دی اور دنیا میں ارزاں مصنوعات کی وسیع پیمانے پر ترویج کا سبب بنا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ پوری تحریک جسے "حرفتی انقلاب" کہا جاتا ہے، انگلستان، ممالکِ متحدہ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ اور بلجیم کی تجارت، اقتدار، اور مال دولت میں زبردست اضافے کا باعث ہوا۔ ان ملکوں میں اس نئے نظام کو جاری کرنے کے لیے حالات موزوں تھے۔ کوئلہ اور لوہا ان کے پاس بہت تھا۔ لیکن ایک عرصے تک اس کا نتیجہ مزدور طبقے کے لیے خوف ناک افلاس اور فلاکت ہی رہا۔

انیسویں صدی کے دوران میں کچھ تو بے غرض حامیوں کی کوششوں سے اور زیادہ تر مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں کے ذریعے سے مزدور اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے اور ان پر عمل کروانے کے قابل ہوئے۔ ان سے صنعت و حرفت کے مرکزوں میں اصلاح ہوئی اور نظامِ کارخانہ داری کی بدترین خرابیوں کو روکنے کے لیے قوانین منظور کیے گئے۔ مگر سرمایہ داروں کی دولت اور مزدوروں کی غربت میں جو واضح فرق ہے وہ ابھی تک جاری ہے، اور کئی اعتبار سے صنعت و حرفت کا مسابقتی نظام تباہی اور بے مہارگی کی طرف لیے جا رہا ہے۔

چناں چہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے تعلقات اور سابقتی نظام کی اصلاح ایسے اشد ضروری مسائل ہیں جن سے انسانیت کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ ان کو حل کرنے کے لیے مختلف طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔ اشتراکی سمجھتے ہیں کہ پیدائش دولت کے ذرائع کی مالک ریاست ہے۔ ریاست سے ان کی خواہش ہے کہ وہ صنعت و حرفت کا اس طرح انتظام کرے کہ اس میں پوری جماعت کے مفاد کا خیال رکھا جائے۔ سابقتی نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جب وسیع پیمانے پر ریاستی انتظام کرنا پڑا تو جنگ عظیم کے دوران میں یہ تجربہ ہوا کہ صنعتی مسئلے کا یہ حل حکومت پر ایک وسیع اور گراں خرچ محکمے کا بار ڈال دیتا ہے، جسے تجارت اور صنعت و حرفت پر پورا اختیار دیا جاتا۔ یہ بات بھی زیر بحث ہے کہ مسابقت سے جو سرگرمی پیدا ہوتی ہے، اب اس کے نہ ہونے سے دریافت اور تحقیقات کی روح مردہ ہو جائے گی۔

ایک دوسرا حل جو آج کل بار بار پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک صنعت کی نگرانی اس کے کارکن خود اپنے مفاد کے لیے کیا کریں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے شدید صنعتی اور سیاسی بدنظمی بلکہ بدامنی پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔

ایک انتہائی قسم کا خیال انیسویں صدی میں جرمنی کے اشتراکی کارل مارکس نے پیش کیا ہے۔ اس نے "جماعتی جنگ" کی تلقین کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ جنگ متوسط طبقوں کو سرمایہ داری کے خلاف لڑنی چاہیے۔

"پرولتاری" یہ عوام کے ذریعے سے عوام کے لیے صنعت و حرفت کے انتظام میں کارل مارکس کے متبعین نے ایک نہایت ہی وسیع اور بے حد دل چسپ تجربہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے ۱۹۱۷ء سے قدیم تباہ کن استبداد کے خاتمے کے ساتھ ہی روس پر اپنا اقتدار جما لیا ہے۔ بعض لحاظ سے روسی مارکسوں

یا بالشوکوں کے اس تجربے نے نہایت اہم نتائج پیدا کیے ہیں۔ لیکن بیرونی مداخلتوں، زمین کے لیے کسانوں کی حرص اور روسی رعایا کے بہت بڑے حصے کی جہالت و غفلت نے اسے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے علاوہ انتہائی سختی اور تشدد نے یورپی رائے عامہ کو اس کا مخالف بنا دیا ہے۔ اگر اسے خارجی معیاروں سے جانچا جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے روس کی خوش حالی اور شادمانی میں کوئی اضافہ کیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے پیٹروگراڈ کی آبادی تقریباً بیس لاکھ سے ستّر ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ شہر میں سالانہ اموات کی شرح دہشت ناک طور پر فی ہزار اسّی تک جا پہنچی ہے۔ اس کے علاوہ سنہ ۱۹۲۱ء میں روس کے مشرقی اضلاع میں خوف ناک قحط پڑا، اور دو کروڑ کے قریب آبادی کو فاقہ کشی کی مصیبت اٹھانی پڑی۔ اس قحط میں اتنی زیادہ شدّت پیدا ہونے کے کئی اسباب تھے، ایک تو یہ کہ بالشوک غلّے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دوسری طرف وسائل حمل و نقل شکست ہو گئے تھے[۵] جس کی وجہ سے غذائی رسد کی تقسیم ناممکن ہو گئی تھی، اور ایک وجہ یہ ہوئی کہ خانگی تجارت کو بالشوکوں نے ممنوع قرار دے دیا تھا، اس کی وجہ سے غذا کے پیدا کرنے میں سرگرمی کم ہو گئی تھی۔

صنعتی مسئلے کو حل کرنے کے لیے غالباً سب سے زیادہ امید افزا حل "اتحادِ باہمی" کے نظام میں پایا جاتا ہے۔ یہ نظام بہت تیزی سے ملکوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے سینکڑوں اتحادی کارخانے تقسیم کرنے والے مخازن، ڈائریاں، بنک، تعمیری سوسائٹیاں قائم ہو گئی ہیں۔ اس نظام کے

---

[۵] کم از کم حمل و نقل کے وسائل کا انقطاع ایک حد تک ممالکِ غیر اور روس کے باہمی تجارتی تعلقات کے منقطع ہونے سے ہے۔ اس لیے کہ وہ خود ٹھیک طور پر ریلوے سامان کی سربراہی نہیں کر سکتا تھا۔

ماتحت سامان کے بنانے اور تقسیم کرنے کے لیے متحدہ طور پر تیار کرنے، خریدنے اور فروخت کرنے کی وجہ سے، بنانے اور نکاسی کرنے والے آپس میں متحد ہو جاتے ہیں۔ یا (زرعی اتحادِ باہمی میں سود پر قرض لینے سے) نکاسی کرنے والے بنانے والے بن جاتے ہیں۔ منافع میں شرکت یا تو بالا دست منافع کو آپس میں تقسیم کر کے کی جاتی ہے، یا اغراضِ مشترکہ میں صرف کرنے سے۔ تنہا انگلستان ہی میں تحریک اتحادِ باہمی کے چالیس لاکھ سے زیادہ اراکین اور سالانہ تینتیس کروڑ پونڈ سے زیادہ کی داد و ستد ہوتی ہے۔

سائنس کی برکتیں

اگرچہ صنعت و حرفت کی تنظیم جدید کے نتیجے کے طور پر ایسے نازک مسائل پیدا ہو گئے ہیں لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ سائنٹی فک تحقیقات کی رُوح کے احیا اور عملی زندگی میں اس کے استعمال نے انسانیت کو بے شمار فوائد پہنچائے ہیں۔

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں زراعت، بافندگی، لہاری، اور مغربی یورپ کے ذرائعِ حمل و نقل ابھی تک اسی حالت میں تھے، جیسے کہ رُومیوں کے زمانے میں بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی بُری حالت میں تھے۔ پھر چند نسلوں کے بعد ایجادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے انسانی زندگی کے حالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ سائنٹی فک طریقۂ تحقیق نے قوانینِ قدرت کے جو قاعدے مرتب کر دیے تھے، وہ اب وسیع پیمانے پر استعمال کیے گئے۔ گزشتہ دو صدیوں کے دوران میں انسان نے سائنس کے ذریعے سے قدرت پر عام فتح حاصل کر لی ہے، اور اب وہ اپنے ماحول کا غلام بننے کی بجائے اس کا آقا بن گیا ہے۔ اس نے ریل اور دخانی جہاز بنانا سیکھ لیا ہے، جن سے دنیا کے دُور دست حصّوں سے غذا لائی جا سکتی ہے۔ قحط کا انسداد ہو گیا ہے اور ایسے ملکوں کی وسیع

آبادی خوش حالی میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہوگئی ہے جن کی تنہا زراعت ان کی گزر بسر کے لیے قطعی ناکافی تھی۔ اس نے معلومات میں بے انتہا اضافہ کرلیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے انسانی جسم کی ساخت اور اس کی تاریخ معلوم کرلی ہے۔ امراض کی ماہیت اور اس کے خلاف جنگ کرنا سیکھ لیا ہے۔

سترھویں صدی کی ابتدا میں ہاروے نے دریافت کیا کہ خون جسم میں گردش کرتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں جینر نے چیچک کا ٹیکہ دریافت کیا۔ ۱۸۴۶ء میں بے ہوش کرکے پہلا اہم ترین عمل جراحی کیا گیا۔ اس سے پہلے ایسے جراحی عمل شاذونادر ہی کیے گئے تھے۔ ایک مشہور دواخانے میں اسی عمل بے ہوشی کے انکشاف سے پہلے بہ مشکل سالانہ تیس آدمی عمل جراحی کے لیے راضی ہوئے تھے۔ پچاس سال بعد اسی دواخانے کا سالانہ اوسط ۳۰۰۰ تھا[1]

یہ صرف ایک مثال ہے اس حیرت انگیز طبی سائنس کی ترقی کی جس کا نتیجہ تکلیف میں قابل قدر تخفیف اور تحفظ جان ہے۔

۱۸۵۹ء میں چارلس ڈارون کی معرکتہ الآرا کتاب "اوریجن آف اسپیشز" منظر عام پر آئی۔ جس طریقے سے ارتقا کے ماتحت حیات ادنا اقسام سے اعلا اقسام میں راست انسان تک نشوونما پاتی گئی ہے، اس کے متعلق لوگوں کے خیالات میں اس کتاب سے یک سر تبدیلی پیدا ہوگئی۔

اسی زمانے میں فرانسیسی سائنس داں اس دشوار ترین تحقیقات میں مصروف تھا کہ کس طرح بہت ہی چھوٹے چھوٹے جراثیم یا جرثوموں کے ذریعے سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایسے طریقوں کے ایجاد کرنے میں بھی مصروف تھا جن کے ذریعے سے ان جراثیم کے برباد کن عمل کا خود

---

[1] رابن سن اور برڈ کی کتاب "موجودہ یورپ کی ترقی" صفحہ ۳۱۷۔

انھی جراثیم کے مرکب ٹیکے کے ذریعے مقابلہ کیا جا سکتا ہو۔

سائنس دانوں کی طول طویل فہرست میں ہم نے اوپر صرف دو نام سرسری طور پر لے لیے ہیں۔ یہ ان بہت سے سائنس دانوں میں سے صرف دو نام ہیں جنھوں نے امراض پر فتح پانے اور اپنے ہم جنسوں کو تکلیف اور بے وقت موت سے بچانے کے لیے اپنے علم و فطرت و حیات کو استعمال کیا ہو۔

سائنس نے تباہی کے خوف ناک آلات پیدا کیے ہیں۔ طویل زد کی توپیں، دھماکو شل، زہریلی گیس، آب دوز کشتیاں، یہ سب اسی کے کرشمے ہیں۔ صنعت و حرفت میں ان کے استعمال نے خطرناک افلاس اور مصیبتیں پیدا کر دی ہیں لیکن اس نے دُنیا کی آبادی میں زبردست اضافے کو ممکن بنا دیا ہو۔[1] سائنس نے انسانی زندگی کو طویل کر دیا ہو۔ اموات کی شرح گھٹا دی ہو اور انسان کو قدرت کی پوشیدہ قوتوں اور خود اپنی قسمت پر ایک نیا اقتدار عطا کیا ہو۔

خود مختاری

قرونِ وسطیٰ میں بیرونی شہنشاہیت اور جاگیری نظام کے اہیڑیں کے خلاف کسانوں اور شہریوں کی بغاوتوں کو چھوڑ کر، یونانی روحِ خود مختاری (یعنی ایک قوم کا حکومتِ خود مختاری و آزادی کے حق) کے

---

[1] سنہ ۱۴۰۰ء میں یورپ کی آبادی کا تخمینہ پچاس ملین کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۸۲۷ء میں یہ آبادی بڑھ کر دو سو اکیس ملین، سنہ ۱۸۶۲ء میں تین سو اٹھائیس ملین اور سنہ ۱۹۰۷ء میں چار سو پانچ ملین ہو گئی۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا) ایک اور تخمینے کی رو سے (اسٹیٹس مانیس ریڑ بک) سنہ ۱۹۱۸ء میں پانچ سو تین ملین تک پہنچ جاتی ہو۔ امریکہ کی آبادی سنہ ۱۸۰۹ء میں ۸ ملین تھی جو بڑھ کر سنہ ۱۹۰۷ء میں ایک سو پچاس ملین ہو گئی۔ یہ اضافہ زیادہ تر جدید صنعت و حرفت اور ذرائع حمل و نقل کی وجہ سے چھوٹے سے علاقے میں بسنے والی کثیر آبادی کو ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا نتیجہ ہو۔

احیا کی ابتدا سولھویں صدی کی اس جان توڑ بغاوت سے ہوتی ہے جس میں ہالینڈ نے ظالم اسپینی حکومت سے اپنا حقِ آزادی منوایا اور اسے حاصل کر لیا۔

اس بغاوت (۱۵۷۲ء تا ۱۶۰۹ء) کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایک چالیس سالہ جنگ میں ایک چھوٹی سی قوم نے جس میں زیادہ تر کسان اور دیہاتی تھے، اور جو ایک ایسے دلدلی ملک میں رہتی تھی جس کا طول ایک میل اور عرض تیس میل سے زیادہ نہ تھا۔ دنیا کی سب سے طاقت ور سلطنت کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اس عظیم الشان سلطنت کے پاس امریکہ کی دولت، اس زمانے کے بہترین سپہ سالار اور بہ ظاہر کبھی نہ ختم ہونے والی یورپ کے بہترین سپاہیوں سے مرتب عظیم الشان فوجیں تھیں۔ ولندیزی جن کے پاس ایسے اتحادی تک نہ تھے جن کا نام لیا جا سکتا۔ انتہائی دردناک مصیبتوں اور اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نہ صرف اپنی آزادی ہی حاصل کر لی بلکہ اس کے حصول کے دوران میں اپنے محصور شہروں کے پیچھے اور اپنے برباد شدہ ملک کے بازو پر یورپ میں درجۂ اول بحریہ تعمیر کر لیا اور ساری دنیا میں اپنی تجارتی برتری قائم کر لی۔

یہ حیرت انگیز استقلال جس کی بدولت ایسی زبردست فتح حاصل ہوئی، زیادہ تر ایک شخص کے ایقان، اس کی ہمت اور اس کے مغلوب نہ ہونے والے ارادے کا نتیجہ تھا۔ ابھی آدھی جنگ بھی ختم ہونے نہ پائی تھی کہ اس کے ملک کے دشمنوں نے اسے دھوکے سے قتل کر دیا۔ یہ شخص جس نے انفرادی طور پر سب سے بڑھ کر یونانی روحِ آزادی کو دنیا میں پھر زندہ کر دیا تھا، ولیم دی سائلنٹ تھا۔

اٹھارویں صدی میں امریکی نوآبادیوں نے واشنگٹن کی قیادت میں انگلستان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ عظمت کے لحاظ سے ولیم دی سائلنٹ کے

بعد اسی قائد کا درجہ ہو جس نے پھر ایک بار اسی روح کو زندہ کر دیا تھا۔

ایک نسل کے گزر جانے کے بعد نپولین کی استبدادی شہنشاہیت کا ظہور ہوا۔ کچھ عرصے تک تو اس نے رومی سلطنت میں جس عالمی سلطنت کا وجود تھا اس کے تصور کو بعض لحاظ سے پھر زندہ کر دیا۔ نپولین کی عالمی سلطنت اگرچہ خود مختار مرکزی حکومت تھی مگر اس میں انسان انسان کے درمیان مساوات، روشن خیال نظام قانون اور ایک آزاد و شایستہ تمدن کے اصولوں پر اس کی تنظیم ہونی باقی تھی[1] لیکن انیسویں صدی کی ابتدا میں ایسا تصور ایک شدید سوہانہ غلطی تھی۔ نپولین کو اسی قومیت نے تباہ کیا جس کے ساتھ اس نے اور اعتبار سے بے اعتنائی برتی تھی۔ لیکن ایک لحاظ سے نپولین نے اسی قومیت کا مظاہرہ انتہائی جارحانہ اور خطرناک طور پر کیا تھا۔ روس، اسپین اور جرمنی میں قومیت نے زور پکڑا اور اسے کچل کر رکھ دیا۔ انگلستان میں قومیت اپنے جارحانہ پہلو سے ہمیشہ برسرپیکار رہی۔

نپولین کی شہنشاہیت کی شکست نے خود بخود یونانی روح خود مختاری کے احیا کا کام کیا۔ نصف صدی کے گزرنے کے بعد دورِ حاضرہ میں ان عجیب وغریب سلسلۂ واقعات کے دوران میں یہ روح اپنے درخشاں انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہو جن سے اطالیہ غیر ملکی حکومت اور استبدادیوں سے نجات پاکر پیڈمانٹ کی دستوری حکومت کے حلقے میں متحد ہو گیا۔ اطالیہ کی غداری کی "قیامت خیز" داستان ۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک جاری رہی۔ پیڈمانٹ کے دلیر بادشاہ وکٹر امانیول کے علاوہ مازینی کیوور اور گری بالڈی اس کی

---

[1] فرانس میں ایک حد تک اس کا انحصار عام مرضی پر تھا، اور یہ رائے عامہ کے ذریعے حاصل کی جاتی تھی۔

اہم شخصیتیں ہیں۔ مازینی جمہوریت کا فلسفی تھا۔ اس نے اطالیہ کو اتحاد اور آزادی کا معتقد بنایا اور ۱۸۴۹ء میں رومی جمہوریت کے چند مہینوں کی مختصر مدت میں اس بات کی غالباً سب سے نمایاں مثال دنیا کو دکھادی کہ کس طرح ایک فلسفی عملی حاکم بن سکتا ہے۔ کیوور پیڈمانٹ کا بہت زبردست اور دانش مند مدبر تھا۔ اس نے بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ آسٹروی شہنشاہیت کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ گریبالڈی ایک دلیر کسان کپتان اور اطالوی محبانِ وطن کا معبد تھا۔ اس نے دشمنوں کے خلاف کئی مایوسانہ مہموں کی قیادت کی۔ اس کی مختصر سی سرخ قمیص رضاکار فوج نے نیپلز کی استبدادی فوجوں کو نہایت کامیابی کے ساتھ معجزانہ طور پر شکست دی اور یوں اس نے نیپلز کے علاقے کو آزاد شدہ اطالیہ کے ساتھ متحد کر دیا۔

دستوریت ہم یہ بتا چکے ہیں کہ مسلسل اصلاحات کے ذریعے سے جس کی ابتدا منشورِ اعظم سے ہوئی تھی۔ کس طرح انگلستان میں پارلیمانی حکومت کا آغاز ہوا۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ کس طرح بادشاہت کو حکومت کے دستوری طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

سولھویں صدی کے دوران میں ٹیوڈر خاندان کی طاقت ور اور خود مختار بادشاہت پارلیمنٹ کے دباؤ سے مخلصی پانے میں کامیاب ہوگئی لیکن سترھویں صدی میں کم زور اور ضدی سٹوارٹ بادشاہوں کی ایسی ہی کوششیں پہلے تو موجب نزاع بنیں، پھر انگلستان کی قدیم دستوری آزادیوں کے مطالبے اور آخرکار بادشاہ اور پارلی منٹ میں ایک عظیم خانہ جنگی کا باعث ہوئیں۔ اس جنگ میں بادشاہ کو شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ یہ زیادہ تر اولیور کرامول کی دانش مندانہ انتظامی قابلیت کا نتیجہ تھا۔ اولیور

کراموِل خود بعد میں ایک فوجی حکومت کا صدر بن گیا۔ اس کی یہ فوجی حکومت بادشاہت سے بھی کہیں زیادہ غیر دستوری ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کا اقتدار اور دستوری بادشاہت پھر سے قائم ہوگئی۔ اس صدی کے اختتام تک پارلیمنٹ نے بادشاہ کو معزول کرنے اور بادشاہ کے تمام کاموں پر ایسے وزیروں کے ذریعے سے جو اس کے سامنے جواب دہ تھے نگرانی کرنے کا اختیار کام یابی کے ساتھ استعمال کیا۔

اٹھارھویں صدی کے دوران میں پارلیمانی حکومت کو اور بھی زیادہ عروج حاصل ہوا۔ پارٹی سسٹم کا طریقہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگیا۔ اس کے ماتحت جب ایک حکومت بے اقتدار ہو جاتی تو بجائے اس کے کہ ارکینِ قانون باہر ہو جائیں یا نکال دیے جائیں، اخلاقی ارکین کی حیثیت سے پارلیمنٹ ہی میں رہنے لگے۔ اس اصول پر بھی عمل کیا جانے لگا کہ کابینہ میں تمام وزیر، وزیر اعظم کی رہ نمائی میں متحدہ طور پر کام کریں۔ کابینہ کے تمام وزیر بہ طور ایک جماعت کے مقرر ہوں اور اسی طرح علیحدہ کیے جائیں، اور پوری کابینہ اپنے ارکین کی حکمتِ عملی اور طریقۂ کار کی ذمے دار ہوگی۔ لیکن اس کا حلقۂ انتخاب نہایت محدود تھا، اور بڑے بڑے زمین داروں کی ریشہ دوانیوں کا راستہ خطرناک طور پر کھلا تھا۔

انیسویں صدی کے دوران میں حلقہ ہائے انتخاب کو کئی اصلاحی قوانین کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ وسعت دی گئی۔ ان میں سب سے زیادہ اہم قانون ۱۸۳۲ء میں اشرافیہ کے ساتھ ایک شدید لیکن دستوری کش مکش کے بعد منظور کیا گیا تھا۔ پارلیمانی انتخاب کی مشنری پر اب تک زیادہ تر یہی جماعت حاوی تھی اور اس کے ذریعے سے ملک کی حکومت

پر اس کا قبضہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں عورتوں کو اس میں شریک کر لیا گیا۔ قوم کی مرضی جو دارالعوام کے ذریعے سے ظاہر کی جاتی تھی، اس کو نامنظور کرنے کا جو اختیار دارالامرا کو حاصل تھا، اس میں چند سال ہوئے اچھی طرح کاٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ چناں چہ اس وقت جمہوری طور پر مرکب دارالعوام انگلستان میں کامل شاہی اقتدار استعمال کرتا ہے۔ اگر کابینہ دارالعوام کا اعتماد کھو دیتی ہے، یعنی اکثریت اس کی حامی نہیں رہتی تو اس کے اراکین کو یا تو مستعفی ہونا اور دوسری جماعت کے لیے جگہ خالی کرنا ہوتا ہے، جسے اکثریت حاصل ہوتی ہے، یا اسے بادشاہ سے درخواست کرنی پڑتی ہے کہ وہ پارلیمنٹ کو برخاست کر دے اور ایک نئے انتخاب کا حکم دے۔ تازہ انتخاب کی درخواست اس توقع پر ہوتی ہے کہ ممکن ہے قوم ان کی حکمت عملی سے اس کے حامیوں کے انتخاب کے ذریعے سے پسندیدگی کا اظہار کرے۔ یہ حقیقت کہ کسی نزاعی موقع پر پارلیمنٹ کو توڑ دینا، اور جدید انتخاب کا عمل میں لانا، اور دوسری جمہوری دستوروں کے مقابلے میں انگریزی وضعِ قانون کے کام کو بہت زیادہ رائے عامہ کا لحاظ کرنے والا اور بہت زیادہ عوام کی مرضی کا نمایندہ بنا دیتا ہے۔ دوسری جمہوری دستوروں میں دونوں قانون ساز مجلسوں کے اراکین مقررہ سالوں کی ایک میقات کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی غیر معمولی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اس کو ایسے لوگ طے کرتے ہیں جن کا انتخاب اس مسئلے میں ان کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا تھا۔

اس طرح برطانیۂ عظمیٰ کے جدید دستور نے بادشاہ اور امرا کی قوت کو پوری طرح قوم کے اقتدار کے ماتحت کر دیا ہے۔ یہ اقتدار قوم دارالعوام میں اپنے نمایندوں کے ذریعے سے استعمال کرتی ہے۔ اس دستور کی بنیادی

خصوصیات کی دُنیا بھر میں نقل کی گئی ہے۔

جمہوریت میں عموماً دستوری بادشاہت کی بہ نسبت صدرِ جمہوریہ کو بادشاہ سے زیادہ اختیار دیا جاتا ہے۔ مقننہ کا دوسرا چیمبر یا سینیٹ، عموماً انگریزی دارالامرا سے بہت زیادہ مقتدر ہوتا ہے، اور ایک جداگانہ اقتدار (یعنی ممالکِ متحدہ میں سپریم کورٹ آف جوڈیکیچر) اس کی نگرانی کے لیے قائم کیا جاتا ہے تاکہ حکومت کے مختلف شعبے اپنی مقررہ حدُود سے متجاوز نہ ہونے پائیں۔

اس طرح دستوری قانون کے بنیادی اصولوں کا احترام کرنے کی یونانی روحِ آزادی، جمہوریت کی پناہ گاہ کی حیثیت سے دُنیا میں پھر زندہ ہو گئی۔ اس میں زیادہ تر برطانوی پارلیمنٹ کی تدریجی ترقی، اس کے قوانین کی تدوین، اس کے پارلیمانی اداروں کے قیام اور دُنیا کی روشن خیال قوموں نے جو اس کی نقل کی ہے، ان سب چیزوں نے بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ بہت سے ملکوں میں مکتوبی دستور کے ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں خطرہ ہے کہ یہ بے روح اور بے لوچ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ترقی کے راستے میں روڑا نہ ثابت ہو۔ لیکن یہی چیز نئے قائم شدہ جمہوری اداروں کو منظم اور مستحکم کرنے میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسا دستور اکثر ایک احترام آمیز شیفتگی کا سبب بن جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدیم یونانی شہری اپنی شہری ریاست کے بنیادی قوانین کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔

جمہوریت اگرچہ اٹھارویں صدی کے دوران میں انگلستان کی حکومت ایک دستوری بادشاہت تھی، تاہم رائے دہی کا حق اتنا محدود تھا اور اشرافیہ نے اصلی اقتدار کو اتنی تنگ دلی کے ساتھ اپنے قبضے میں رکھا تھا کہ کسی معنی میں بھی یہ جمہوریت نہیں کہلا سکتی تھی۔[۱]

(حاشیہ صفحہ ۲۳۳ پر دیکھیے)

یورپ کے اور مقاموں پر اس صدی میں مطلق العنان ہی حکمراں تھے جو کم و بیش نیک دل تھے اور مختلف اقوام کو اس طرح منظم کر رہے تھے کہ یہ اپنی اصلاح کریں اور پھلیں پھولیں۔ یہ تنظیم خود اصلاحی، توسیع اور باہمی مخالفت کے سلسلے میں بہت ہی معقول تھی اور ایک دوسرے کی رقابت پر مبنی تھی لیکن یہ لوگوں کے بے شمار گروہوں کو جاگیری نظام کی ظالمانہ باقیات سے نجات دلانے میں ناکام رہے۔

۱۷۸۳ء میں جب انگلستان نے امریکی نوآبادیوں کی آزادی تسلیم کر لی تو آبادکاروں نے اپنی نئی قوم کی تنظیم شروع کر دی۔ یہ تنظیم انتہائی جمہوری طریقوں پر ہوئی تھی۔ یہ طریقے وہ تھے جو بڑے بڑے سیاسی مفکروں نے تجویز کیے تھے۔ اور ان میں سب سے بڑا فرانسیسی مفکر روسو تھا۔ موروثی حقوق و مراعات منسوخ کر دیے گئے۔ قانون کو اتنا سادہ، مساویانہ اور وسیع کر دیا گیا کہ عملاً تمام یورپی نسل کے بالغ مرد آبادی کو اس میں شریک کر لیا جا سکے۔ معاشرتی اور معاشی تغیرات نے جائداد کی عموماً اور زمینی جائداد کی خصوصاً وسیع تقسیم کا آغاز کر دیا۔ چند سال بعد ان اصلاحوں کی عمدگی نے ایک انگریز سیاح ولیم کوبٹ کے دل میں اشرافیہ کے خلاف غصّے کی آگ بھڑکا دی۔ جنھوں نے اس کے ملک میں ۱۸۳۲ء کے ریفارم بل تک "بادشاہ اور رعایا دونوں کو یکساں پامال کر رکھا تھا" لیکن ان اصلاحوں کا سب سے زیادہ قابلِ لحاظ اثر خود ممالکِ متحدہ سے باہر آزاد خیال اور سمجھ دار فرانسیسیوں پر پڑا۔

فرانس میں اٹھارویں صدی کے دوران میں کثرت سے سیاسی خیال

(صہ ۲۳۲ کا حاشیہ) سنہ ۱۷۹۲ء میں اندازہ کیا گیا تھا کہ کل ۴۰۰ ایم پی جن میں سے ۳۰۰ امرا میں سے تھے، انگریز دار العلوم کی اکثریت کے انتخاب کو خود غرضانہ چالوں سے اپنے قابو میں رکھتے تھے۔

آرائیاں اور مباحثے ہوتے رہے۔ مان ٹیگو نے موجودہ سیاسی اداروں پر سخت تنقید کی۔ بہت سے روشن خیال مصنفوں نے جو "ان سائیکلوپیڈیا" کے نام سے مشہور ہیں، یہ اعلان کر دیا کہ موجودہ حالات اکثر و بیشتر غیر منصفانہ ہیں۔ روسو (۱۷۱۲ء۔ ۱۷۷۸ء) نے اس عقیدے کا پرچار شروع کیا کہ انسان پاک باز اور شاداں ناقص معاشرتی اور سیاسی نظام کی وجہ سے اپنے اس مقام سے گر گیا ہے۔ اگرچہ اس کی تحریروں میں دلائل صحیح نہیں تھے۔ تاہم انھیں بہت بڑی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح جب ۱۷۸۹ء میں شاہِ فرانس اپنی حکومت کے دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے اسٹیٹ جنرل (فرانسی پارلیمنٹ) کے طلب کرنے پر مجبور ہو گیا جو ۱۶۱۴ء سے اب تک طلب نہیں کی گئی تھی تو قوم جو ناپاک ظالمانہ سیاسی نظام کی گوناگوں خرابیوں سے نالاں ہو رہی تھی، یکایک جمہوری حکومت کے لیے اُبل پڑی اور اس جوش کے سیلاب میں مطلق العنان بادشاہت اور جاگیری مفاد دونوں تنکے کی طرح بہہ گئے۔

انقلابِ فرانس کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ ایک حقوقِ مساوات اور جمہوری آزادی کی زبردست تحریک تھی یعنی یہ ایک ایسی سوسائٹی اور ایک ایسے نظام کی تحریک جس میں ہر شخص کو خواہ وہ کسی ذات یا خاندان کا ہو اس کا مساوی موقع حاصل ہو کہ وہ اپنی فطری بلندیوں کی آخری حد تک پہنچ سکے اور اپنی قوم کی رہنمائی کر سکے۔ اس حیثیت سے انقلابِ فرانس ایک ایسی تحریک تھی جو یونانی تصورات کے احیا میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یورپی قوموں نے ایک ایسی قوم کو بیدار ہوتے دیکھا جو متحد و مستحکم خود مختار اور مساوات و اخوت میں متحد تھی۔ اس میں نہ قدیم روم کی طرح کوئی مخصوص حقوق کا حکمراں طبقہ تھا، نہ امریکہ کی طرح اس میں ایسی قوم تھی جو غلامی

میں دبی ہوئی ہو۔ اور نہ جاگیری اشرافیہ کی ظالمانہ باقیات تھیں جو انگلستان میں چلی آتی تھیں۔ لیکن بے لگام عوام کی دہشت انگیز حکومت "تحفظِ عامہ کی مجلس" کے خونی استبداد، جمہوریت کے بھیس میں جارحانہ قومیت کے خطرناک ہیجان، نپولین کی فوجی شہنشاہیت اور آخر کار لوئی ہفت و ہم کی بحالی سے قدیم فاسد مطلق العنانی کا ردِ عمل، ان سب باتوں نے بہت جلد اس تصوّر اور اس خیال کو دھندلا کر دیا۔ تاہم کوئی چیز جمہوریت کی قیامت خیزیوں کو لوگوں کے دلوں سے محو نہ کر سکی۔ مقدس اتحاد کی تمام پیش بندیوں اور سختیوں کے باوجود آزاد خیالی کی رَو نے بتدریج زور پکڑا۔ اور ۱۸۴۸ء میں تقریباً تمام یورپی ملکوں میں پھر ایک انقلاب پھوٹ پڑا۔ اس "حیرت انگیز" سال کے بعد پھر ردِ عمل کا زمانہ آیا۔ لیکن اب دنیا میں کوئی جبر و تشدد انقلابی جمہوریت کی قوت کا مستقل طور پر مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یورپ کا ہر ملک یا تو ایک باقاعدہ دستوری تغیر یا فوری انقلاب کے ذریعے سے اشرافیہ کی مراعات کو منسوخ، استبداد کی قوت برباد اور حقِ انتخاب کو وسیع کر کے عوام تک پہنچانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ تجربے نے ثابت کر دیا کہ ایسے جمہوری اداروں کے صحیح عمل کا دارو مدار زیادہ تر ایک موثر اور لازمی نظام تعلیم کے اجرا پر ہے۔

اس طرح آزاد اور مساوات پسند جمہوریت کی یونانی روح ـــــ وہ روح جو انقلابِ فرانس کے نعرے "حریت، مساوات، اخوت" میں مجتمع ہو گئی تھی ـــــ دنیا میں واپس آ گئی ہے، اور روس کے سوا ہر جگہ اس کا احترام اور عزت کی جاتی ہے۔ روس میں جمہوریت اور نمایندہ حکومت کو (جیسا کہ اور مقاموں پر اس اصطلاح کے معنی لیے جاتے ہیں) اس بِنا پر نامنظور کر دیا گیا

ہو کہ یہ لازمی طور پر بہت زیادہ قوت تعلیم یافتہ اور بے کار اوسط طبقے کے ہاتھ میں دے دیتی ہو۔ ایسے لوگوں کے مفاد بھی حرفتی سرمایہ دارانہ نظام کے جیسے ہی ہیں۔ اس نظام میں سرمائے دار جب کبھی کسی حرفت کا اہتمام اور انتظام کرتے ہیں تو اس سے خود ہی نفع پاتے ہیں یا نقصان اٹھاتے ہیں۔ مزدور بلا لحاظِ نفع و نقصان مقررہ اجرت پاتے ہیں۔ نفع میں ان کو کوئی حصّہ نہیں دیا جاتا۔

روس میں بالشویک حکومت "پرولتاریوں کی آمریت" کے قیام کی ایک کوشش ہو۔ یعنی خود مزدوروں کو حرفتی اور قومی زندگی میں سب سے اعلا و افضل قرار دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا ہو، وہ ہر حرفتی اور ملکی وحدت کے لیے کونسلوں کا (جو "سوئیٹ" کہلاتی ہیں) ایک پیچیدہ نظام ہو۔ اس نظام کے ذریعے سے مزدور اور کسان خود ہی اپنے کارخانوں اور دیہاتوں کا انتظام کریں گے۔

لیکن سویٹ نظام نہایت بے ڈھنگا ہو۔ اس میں بے شمار کونسلیں ہیں، جن کے درجے، اختیارات اور حلقہ ہائے اثر مختلف ہیں۔ روس کے لاتعداد جاہل اور بے حوصلہ عوام میں لازماً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استبدادی اختیارات کا اجتماع چند قابل مگر بے لگام لیڈروں کی ذات میں ہو گیا ہو۔ ایک تازہ ترین کتاب میں ان لیڈروں میں سے ایک بڑے شخص نے اس حالت کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کیا ہو: "انقلاب، انقلابی جماعتوں سے چاہتا ہو کہ تمام اختیاری ذرائع سے اس کا مقصد حاصل کیا جائے۔ اگر اس کے لیے ضرورت ہو تو مسلح بغاوت کی جائے یا بشرطِ حاجت دہشت انگیزی سے کام لیا جائے۔ ایک ایسی انقلابی جماعت جس نے حکومت پر لڑ کر فتح پائی ہو، اس پر مجبور ہو کر

ان تمام کوششوں کو جو حکومت کو اس کے ہاتھ سے چھین لینے کے لیے کی جائیں، انھیں بندوق کے زور سے دبائے۔"[1] یہ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو روبسپیر نے اپنے اعلان میں کہے تھے؛ جو اس نے "مجلسِ تحفظِ عامہ" کی حکمت عملی کے متعلق کیا تھا۔ اسی نے ۱۷۹۳ء سے لے کر ۱۷۹۴ء تک انقلابی فرانس کو خون میں نہلا دیا۔ "ہماری حکمتِ عملی کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ قوم پر حکومت عقل و فہم کے ساتھ کی جائے اور قوم کے دشمنوں پر دہشت سے۔ دہشت محض ایک طرح کا انصاف ہے جو فوری، شدید تر اور مضبوط تر ہے اس لیے انصاف سراسر نیکی ہے۔

ٹراٹسکی نے جمہوریت کے متعلق اس سے بھی زیادہ صاف بیانی سے کہا ہے: "ہم ایسی جمہوریت سے جو پرولتاریوں کے ہاتھ میں ساری قوت دے دیتی ہے، دست بردار ہوتے ہیں" اس طرح اشتراکیت گویا ایک اور نعرۂ جنگ ہے جو ایک مخصوص جماعت نے خود اپنے مطلقانہ اقتدار کے بل بوتے پر ہر شخص کے لیے مساوی حق کے یونانی تصور کے خلاف بلند کیا ہے۔"[2]

---

[1] ٹراٹسکی کی کتاب "دہشت انگیزی کی حمایت میں"

[2] ایک بہت ہی لبرل خیالات رکھنے والے مصنف نے پیٹروگراڈ سوویٹ کو ۱۹۲۰ء میں بوقت ششن دیکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "درحقیقت یہ ہڑبھونگے عوام کا ایک اجتماع تھا جس میں کسی حقیقی قانونی سرگرمی کی اہلیت نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس میں اتنی ہی صلاحیت تھی کہ وہ پلیٹ فارم پر آنے والی برسرِ اقتدار حکومت کو منظوری دے یا اسے نامنظور کر دے۔ انگریزی پارلیمنٹ سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو اس میں اتنی ہی تنظیم، قابلیت اور کام کی صلاحیت تھی جتنی کہ مختلف پہیوں سے بھرے ہوئے ایک بڑے تھیلے اور ایک پرانی، غلط، لیکن چلنے والی گھڑی میں ہو سکتی ہے۔" (ولز، "روس سایوں میں" صفحہ ۱۲۰)

خاتمہ

اب ہم تمدن کے آغاز اور ارتقا کے اس مختصر مطالعے کے آخر میں پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقی تہذیب ایک ایسی حالت ہے جس میں ہر شخص اپنی فطرت کے ہر پہلو کو پوری قابلیت، آزادی اور رضامندی سے انسانیت کی خدمت میں بہ طور کل کے صرف کر سکے۔ ہم اس کے بعض بڑے بڑے دشمنوں کو دیکھ چکے ہیں۔ یعنی خود غرضانہ خواہشات، خود غرضانہ ذات بندی اور جماعت بندی، خود غرضانہ نفاق، خود غرضانہ جاگیری نظام، خود غرضانہ قومیت۔ تہذیب کے یہ دشمن اس لیے خطرناک ہیں کہ یہ صرف ایک جماعت کے مفاد یعنی ایک شخص کے مفاد یا ایک جماعت یا ایک قوم یا ایک پارٹی یا ایک ملک کے مفاد کو تمام نوعِ انسانی کے مفاد سے بالاتر رکھتے ہیں۔

ہم نے ان بڑی بڑی قوموں کا مطالعہ کیا جو تہذیب کے لیے ان دشمنوں سے جنگ کر چکی ہیں۔ ان میں سب سے اوّل مذہبی قوتیں ہیں، جنھوں نے مشرق میں جنم لیا۔ مستقبل کے لیے خدمت کا چینی تصور، ذات اور نفس سے نجات کا ہندی تخیل، اخوت کا اسلامی مطالبہ، خدائی بادشاہت کا عیسائی مژدہ۔ وہ خدائی بادشاہت جس میں تمام انسان ایک الٰہی باپ کے بچوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے متحد اور باہمی محبت سے ایک دوسرے کی خدمت کریں گے یہ سب نہایت اہم مذہبی عناصر ہیں۔

پھر ہم نے تہذیب کے اس مظہر پر غور کیا جسے سب سے پہلے یونانیوں نے عملی اور کام کرنے والے اداروں کی صورت میں پیش کیا تھا، اور دستوری قانون، خود مختاری، جمہوریت، فکر اور ضمیر کی آزادی، سائنٹی فک تحقیقات اور ایک عالمی مملکت کے اصولوں پر اس کی تنظیم کی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عالمی مملکت کی عملی تنظیم اور ایک زبردست باقاعدہ دیوانی اور فوجداری قانون

کی تدوین میں کس طرح روما نے اپنا حق ادا کیا، اور یہ قانون وہ ہو جو انسان انسان کے درمیان تعلقات کو باضابطہ بناتا ہو۔

اس کے بعد ہم نے وحشیوں کے حملوں کے ہیبت ناک نتائج، پھر جاگیری نظام اور اس کے بعد جارحانہ قومیت کے عروج کا مطالعہ کیا۔ تہذیب کے ان دو بڑے دشمنوں کا جن قوتوں نے مقابلہ کیا، اور خاص کر ان عوامل کا جو موجودہ بین قومیت کے عروج کا سامان کر رہے ہیں، ان کا بھی ہم نے جائزہ لیا۔ یہ عوامل وہ ہیں جو ایک عالمی مملکت کی تعمیر کے لیے موثر طور پر بدامن قومیت کو دبائیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر قوم اور ہر فرد کو انتہائی آزادی عطا کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک بین قومی مجلس ایک خاندان اقوام (برطانوی دولت عامۂ اقوام) اور ایک نئی بین قومی قوم (ممالک متحدہ امریکہ) کے تصور کا مطالعہ کیا۔

سب کے آخر میں ہم نے یہ دیکھا کہ حقیقی تہذیب کے وہ علمی اصول اور وہ ادارے جنھیں مدتوں پہلے یونانیوں نے قائم کیا تھا، اب کس طرح جدید دنیا میں پھر زندہ ہو گئے ہیں۔ کس طرح ان کا یہ دوسرا جنم انسانی نسل میں کثیر عددی اضافہ اور بہت سے مختلف قسم کے میدانوں میں آزادی کی طرف زبردست ترقی کے ہم معنی ہو۔ اس طرح جو ترقی کی گئی ہو، وہ اس طریقے پر مبنی ہو جس پر ہماری موجودہ آزادی اور تہذیب کی بنیاد عمیق روحانی حقائق پر رکھی گئی ہو اور ان روحانی حقائق کا اعلان سب سے پہلے مشرق میں کیا گیا تھا۔ محبت، اخوت، مستقبل کی خدمت کے جذبے اور خود غرضانہ جذبات پر فتح پائے بغیر ہماری تہذیب حقیقی اور مستقل تہذیب نہ بن سکے گی، بلکہ ان چیزوں کے بغیر ہماری تہذیب ایک سطحی تمدن، یا ایک عبوری دور بن کر رہ جائے گی اور اس کا انجام وہی بربادی

ہوگا جو روم پر ایک دفعہ آچکی ہے۔

بہر حال، اس سے پہلے انسانیت کی امید اتنی زبردست نہیں تھی جتنی کہ آج ہے۔ یہ زبردست اُمید ہے تہذیب کی، یہ زبردست امید ہے خدائی بادشاہت کی۔ یہ امید صرف اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ تمام روئے زمین پر ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی مرضی سے اپنی پوری زندگی اور اپنی تمام سرگرمیاں انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔

تاریخی جدول

۵۰۰۰۰۰ ق۔م کے قریب	جاوے کا انسان
۲۵۰۰۰۰ ق۔م کے قریب	ہائیڈل برگ کا انسان
۱۵۰۰۰۰ ق۔م کے قریب	پلٹ ڈاون کا انسان
۵۰۰۰۰ ق۔م کے قریب	نینڈرتھال کا انسان (پتھر کے آلات، آگ)
۲۵۰۰۰ ق۔م کے قریب	کرومیناڈ کا انسان (غاروں کی تصویریں)
۱۰۰۰۰ ق۔م کے قریب	جدید حجری عہد کا انسان (زراعت، چمک دار آلات، پالتو جانور)
۶۰۰۰ ق۔م کے قریب	عراق میں سامری تہذیب
۵۰۰۰ ق۔م کے قریب	مصری تہذیب
۴۰۰۰ ق۔م کے قریب	جزیرہ کریٹ کی تہذیب (ملاحی)

۲۷۰۰ ق۔م کے قریب	مصر میں عظیم اہرام کی تعمیر
۲۷۵۰ ق۔م کے قریب	اکادی سلطنت عراق میں
۲۰۰۰ ق۔م کے قریب	چین ایک متحدہ سلطنت کی صورت میں فنیقی تہذیب۔
۱۵۰۰ ق۔م کے قریب	آریا ہندستان اور یونان میں داخل ہوتے ہیں۔
۱۲۰۰ ق۔م کے قریب	یہود فلسطین میں آباد ہو جاتے ہیں۔
۱۲۰۰ ـــ ۱۰۰۰ ق۔م کے قریب	یونانیوں کے ہاتھوں کریٹ کی سلطنت کا خاتمہ۔
۸۵۰ ق۔م کے قریب	حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی سلطنت۔
۸۰۰ ق۔م کے قریب	قرطاجنہ کی بنیاد۔
۸۰۰ ـ ۵۰۰ ق۔م کے قریب	یونانی نوآبادکاری کا زمانہ۔
سنہ ۷۵۳ ق۔م	روما کی بنیاد۔
سنہ ۶۲۱ ق۔م	ایتھنز میں ڈراکو کے قوانین۔
سنہ ۶۰۶ ق۔م	کلدانی سلطنت عراق میں۔
سنہ ۵۹۴ ق۔م	سولن کے قوانین ایتھنز میں۔
سنہ ۵۵۷ ـ سنہ ۵۳۸ ق۔م	عراق میں یہودیوں کی غلامی۔
سنہ ۵۵۰ ق۔م	یہودی پیغمبر حضرت اسحاق کی ولادت۔ مہاتما بدھ اور کنفوشش کا عہد۔
سنہ ۵۴۶ ق۔م	ایرانی لیڈیا کی سلطنت کو زیر کرتے ہیں۔
سنہ ۵۳۹ ق۔م	ایرانی سلطنت عراق میں۔
سنہ ۵۱۰ ق۔م	رومی جمہوریہ کی ابتدا۔

سنہ	واقعہ
۵۰۸ ق۔م	ایتھنز میں کلیستھنیز کے قوانین۔
۴۹۴ ق۔م	ملی ٹس پر ایرانی قبضہ۔
۴۹۴ ق۔م	رومی عوام کو ٹری بیونوں کے تقرر کا حق۔
۴۹۰ ق۔م	میراتھان کے مقام پر ایرانیوں کو شکست۔
۴۸۰ ق۔م	تھرما پیلے اور سلامس پر ایرانیوں کی شکست۔
۴۷۹ ق۔م	پلے ٹیا کے مقام پر ایرانیوں کی شکست۔
۴۶۹ سے ۳۹۹ ق۔م	سقراط۔
۴۶۱ سے ۴۲۹ ق۔م	پری کلیز کا اقتدار ایتھنز میں۔
۴۵۱ ق۔م	رومہ میں قوانین کی تدوین۔
۴۴۵ ق۔م	رومی عوام امیروں کے ساتھ شادی بیاہ کا حق حاصل کر لیتے ہیں۔
۴۲۹ سے ۳۴۷ ق۔م	مفکر افلاطون۔
۳۸۴ سے ۳۲۲ ق۔م	سائنس داں اور مفکر ارسطو۔
۳۶۷ ق۔م	رومہ میں لی سی نین قوانین۔
۳۳۸ ق۔م	فلپ مقدونی یونان فتح کرتا ہے۔
۳۳۴ سے ۳۲۳ ق۔م	سکندر ایشیا میں۔
۳۳۲ ق۔م	سکندر فلسطین اور مصر میں۔
۳۲۳ سے ۲۸۳ ق۔م	مہندس اقلیدس۔
۳۱۰ ق۔م	کتاب یوحنا۔
۲۸۷ سے ۲۱۲ ق۔م	انجینیر آرشمیدس۔
۲۸۵ سے ۲۲۲ ق۔م	انجینیر ہیران۔

۲۸۳ ق۔م	رومیوں کے ہاتھ ایٹرس کانیوں کی آخری شکست۔
۲۸۱ سے ۲۷۵ ق۔م	فے رس کے ساتھ رؤمہ کی جنگ۔
۲۷۶ سے ۱۹۴ ق۔م	ایراٹس تیھنز مہندس۔
۲۷۲ سے ۲۳۱ ق۔م	ہندستان میں اشوک کی حکومت۔
۲۶۴ سے ۱۴۶ ق۔م	قرطاجنہ کے ساتھ رومہ کی جنگیں
۲۱۸ سے ۲۰۳ ق۔م	ہنی بال اطالیہ میں۔
۲۱۴ ق۔م	عظیم دیوارِ چین کی ابتدا۔
۲۰۱ ق۔م	رؤمی سلطنت اسپین میں۔
۲۰۰ ق۔م سے ۲۰۰ء	چین میں ہان خاندان کی حکومت۔
۱۶۷ ق۔م	شام کے یونانیوں کے خلاف یہودیوں کی بغاوت۔
۱۵۰ ق۔م	یاچی منگول مغربی ایشیا میں داخل ہوتے ہیں۔
۱۳۱ ق۔م	شام یہودیوں کی آزادی تسلیم کرلیتا ہے۔
۱۳۳ ق۔م	رؤمی سلطنت ایشیائے کوچک میں۔
۱۰۰ ق۔م	مغربی جانب چینی سلطنت کی توسیع۔
۸۹ ق۔م	تمام اطالوی رؤمی شہریت میں داخل کرلیے جاتے ہیں۔
۸۸ اور ۸۱ سے ۸۰ ق۔م	رؤمہ میں سُلّا کا اقتدار۔
۶۷ سے ۳ ق۔م	پامپی کی فتوحات مشرق میں۔

سنہ ۶۷ ق م	فلسطین پر روما کی فتح۔
سنہ ۶۵ ق م	روما کے ساتھ منگولیوں کا پہلا اتصال۔
سنہ ۵۹ سے ۴۹ ق م	جولیس سیزر گال میں
سنہ ۵۵ سے ۵۴ ق م	" " برطانیہ "
سنہ ۴۴ ق م	جولیس سیزر کا قتل۔
سنہ ۳۱ ق م	آکٹے وین (آگسٹس) رومی شہنشاہ۔
سنہ ۶ ء (؟)	حضرت عیسیٰؑ کی ولادت
سنہ ۲۹ ء	" " کا مصلوب ہونا
سنہ ۵۵ ء سے ۱۲۰ ء	مورخ طاسی ٹس
سنہ ۷۰ ء	روما کے خلاف یہودیوں کی بغاوت و بیت المقدس کی بربادی
سنہ ۱۰۲ ء	چینی، بحر خزر تک پہنچ جاتے ہیں۔
سنہ ۲۱۲ ء	رومی سلطنت کے تمام آزاد باشندوں کو رومی شہریت کے حقوق عطا کیے جاتے ہیں۔
سنہ ۲۴۷ ء	گاتھ، دریائے ڈنیوب کو پار کرتے ہیں۔
سنہ ۲۷۰	روما میں قانون کے ذریعے صنعت و حرفت میں ذات بندی کا نظام جبراً نافذ کیا جاتا ہے۔
سنہ ۲۸۴ ء	شہنشاہ ڈی آک لی ٹین
سنہ ۲۱۳ ء سے ۳۳۷	" قسطنطین۔

سنہ ۳۳۰ء	قسطنطنیہ کی بنیاد۔
سنہ ۴۱۰ء	گاتھ رومہ پر حملہ کرتے ہیں۔
سنہ ۴۴۹ء سے سنہ ۶۱۳ء	انگل، جوٹ اور ساکسن قومیں انگلستان فتح کرتی ہیں۔
سنہ ۴۵۱ء	چالانیس کے مقام پر اٹی لیا کے ماتحت ہنون کی شکست۔
سنہ ۴۵۵ء	وینڈل رومہ چھوڑ دیتے ہیں۔
سنہ ۴۷۵ء	مشرقی رومی سلطنت کا خاتمہ۔
سنہ ۴۹۳ء	اطالیہ کا گاتھ بادشاہ تھیوڈرک۔
سنہ ۵۱۷ء سنہ ۵۶۵ء	شہنشاہِ قسطنطنیہ جسٹنین۔
سنہ ۵۶۸ء	لمبارڈ اطالیہ میں داخل ہوتے ہیں۔
سنہ ۵۷۰ء	حضرت محمد صلعم کی ولادت۔
سنہ ۶۱۸ء	چین میں ٹانگ خاندان کی حکومت
سنہ ۶۲۲ء	حضرت محمد صلعم کی مکّے سے مدینے کو ہجرت
سنہ ۶۳۲ء	حضرت محمد صلعم کی وفات۔
سنہ ۶۳۴ء	جنگِ یرموک (قسطنطنیہ کے رومیوں کو عرب شکست دیتے ہیں)۔
سنہ ۶۳۷ء	قادسیہ کی جنگ (عرب ایرانیوں کو شکست دیتے ہیں)۔
سنہ ۶۶۸ء اور سنہ ۶۷۵ء	عرب قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔
سنہ ۷۱۲ء	عربوں کی فتوحات ہندستان میں۔

۷۱۵ء	عرب سلطنت کی انتہائی وسعت۔
۷۱۸ء	قسطنطنیہ میں عربوں کی شکست۔
۷۳۲ء	ٹورس واقع فرانس میں چارلس مارٹل عربوں کو شکست دیتا ہے۔
۷۵۴ء	پے پن، پوپ کو زمینات عطا کرتا ہے۔
۷۶۸ء سے ۸۱۴ء	فرانکو کا بادشاہ شارلی مین۔
۷۷۴ء	شارلی مین، پے پن کے عطیے کی توثیق کرتا ہے۔
۸۰۰ء	شارلی مین، مغرب کا شہنشاہ۔
۸۰۰ء سے ۱۰۵۰ء	شمال کی قوموں کا حملہ۔
۸۲۷ء	پورے انگلستان کا بادشاہ اِک برٹ
۸۷۱ء سے ۹۰۱ء	" " " الفرڈ۔
۹۱۰ء سے ۱۱۵۶ء	کلونیاکسوں کا عروج۔
۹۱۹ء	جرمنی کا بادشاہ، ہنری دی فولر۔
۹۵۵ء	آٹو اعظم ہنگریوں کو شکست دیتا ہے۔
۹۶۰ء	چین میں سنگ خاندان۔
۹۶۲ء	روما میں شہنشاہ کی حیثیت سے آٹو اعظم کی تاج پوشی۔
۹۸۷ء	ہیوگے پت فرانس کو متحد کرتا ہے۔
۹۸۰ء سے ء	بخارا کا ابنِ سینا۔
۱۰۰۰ء	ہندستان پر افغان حملہ

سنہ	واقعہ
سنہ ۱۰۳۹ء — سنہ ۱۱۰۶ء	شہنشاہ ہنری سوم
سنہ ۱۰۵۶ء — سنہ ۱۱۰۶ء	" " چہارم
سنہ ۱۰۵۸ء	سلجوق ترک بغداد کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔
سنہ ۱۰۶۶ء — سنہ ۱۰۸۷ء	انگلستان کا بادشاہ ولیم اول (نارمن فاتح)۔
سنہ ۱۰۷۳ — سنہ ۱۰۸۵ء	پوپ گری گوری ششم۔
سنہ ۱۰۷۷ء	کانورا کے مقام پر ہنری چہارم کی بے عزتی۔
سنہ ۱۰۹۵ء — سنہ ۱۲۷۱ء	صلیبی جنگیں۔
سنہ ۱۰۹۶ء	عوام کی صلیبی جنگ
سنہ ۱۰۹۹ء	صلیبی جنگ کرنے والے بیت المقدس پر قبضہ کرتے ہیں۔
سنہ ۱۱۵۵ — سنہ ۱۱۹۰ء	شہنشاہ فریڈرک باربروسہ۔
سنہ ۱۱۶۲ — سنہ ۱۲۲۷ء	تاتاری شہنشاہ چنگیز خاں۔
سنہ ۱۱۶۶ء	انگلستان میں جمہوری نظام کا قیام۔
سنہ ۱۱۷۶ء	لگ نانو کی جنگ (لمبارڈ لیگ فریڈرک باربروسہ کو شکست دیتی ہے)۔
سنہ ۱۱۸۷ء	صلاح الدینؒ بیت المقدس پر پھر قبضہ کر لیتا ہے۔
سنہ ۱۱۹۸ء	عرب فلسفی ابن رشد قرطبی کی وفات۔
سنہ ۱۲۱۲ء	"بچوں کی صلیبی جنگ"۔
سنہ ۱۲۱۲ — سنہ ۱۲۵۰ء	شہنشاہ فریڈرک دوم۔

۱۲۱۲ تا ۹۴۱۲ء — سائنس داں راجر بےکن۔

۱۲۱۴ء — پودی نیاس کی جنگ میں شاہ فرانس کی فتح۔

۱۲۱۵ء — منشورِ اعظم (انگلستان کے بادشاہ جان کا عطا کیا ہوا زبردست منشور)۔

۱۲۳۴ء — تاتاری چین کو فتح کر لیتے ہیں۔

۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۳ — یورپ پر تاتاریوں کا حملہ

۱۲۵۴ء — انگلستان میں اعزازی مجسٹریٹوں کا تقرر (یہی مجسٹریٹ بعد میں جسٹس آف پیس کہلائے)۔

۱۲۶۵ء — سائمن ڈی ماں فورٹ، پہلی انگریزی پارلیمنٹ طلب کرتا ہے۔

۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء — دانتے۔

۱۲۷۱ تا ۱۲۹۵ء — مارکوپولو کی سیاحتیں۔

۱۲۹۵ء — شاہِ انگلستان ایڈورڈ اوّل نمونے کی پارلیمنٹ طلب کرتا ہے۔

۱۳۰۲ء — فرانسیسی پارلیمنٹ (اسٹیٹ جنرل) پہلی دفعہ طلب کی جاتی ہے۔

۱۳۰۲ء — کوٹ رائی کی جنگ: فلیمی برگر شاہِ فرانس کو شکست دیتے ہیں۔

۱۳۰۵ تا ۱۳۷۷ء — پاپائی نظام ریگ نان کے مقام پر

	جلاوطنی میں۔
۱۳۱۴ء	اسکاٹ لینڈ کے باشندے بیانک برن کی لڑائی میں انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ دوم کو شکست دیتے ہیں۔
۱۳۱۵ء	سوئزرلینڈ کے باشندے ہیاسبرگ خاندان کو مارٹ گارٹن کی جنگ میں شکست دیتے ہیں۔
۱۳۱۸ء تا ۱۴۵۳ء	انگلستان اور فرانس کے درمیان دو سالہ جنگ۔
۱۳۴۶ء	انگریز تیر انداز کرے سی کے مقام پر فرانسیسی فوج کو شکست دیتے ہیں۔
۱۳۵۶ء	انگریز تیر انداز پائی ٹیرس کے مقام پر فرانسیسی فوج کو شکست دیتے ہیں۔
۱۳۶۸ء	چین میں منگ خاندان کی ابتدا۔
۱۳۷۶ء	انگریزی پارلیمنٹ بادشاہ کے وزیروں پر الزام لگاتی ہے۔
۱۳۶۸ء	سوئزرلینڈ کے باشندے ہیاسبرگ خاندان کو سمپاخ کی جنگ میں شکست دیتے ہیں۔
۱۳۹۹ء	گری سولواس، فلارنس میں یونانی کا پرچار کرتا ہے۔

۱۳۷۸ء	دو دو پوپ۔ ایک روما میں اور ایک اے وگ نان میں۔
۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء	نشاۃ ثانیہ کا عہد
۱۴۱۵ء	آگن کورٹ کی جنگ میں انگریز فرانسیسیوں کو شکست دیتے ہیں۔
۱۴۲۹ء	جون آف آرک، فرانسیسیوں کو انگریزوں کے خلاف ابھارتی ہیں۔
۱۴۵۰ء (تقریباً)	چھاپے کی ایجاد۔
۱۴۵۲ء سے ۱۵۱۹ء	مصوّر اور سائنس داں لیونارڈو ڈاونسی
۱۴۵۳ء	ترک قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیتے ہیں۔
۱۴۸۷ء	"دیاز" راس امید پہنچ جاتا ہے۔
۱۴۹۲ء	موروں کے غرناطہ کی فتح۔
۱۴۹۲ء	کولمبس شرق الہند میں جزیرے دریافت کرتا ہے۔
۱۴۹۸ء	کولمبس امریکہ کا اصلی علاقہ دریافت کرتا ہے۔
۱۴۹۸ء	واسکوڈی گاما ہندستان کے جنوب میں کالی کٹ پہنچتا ہے۔
۱۵۱۲ء سے ۱۵۲۹ء	انگلستان میں کارڈینل ولزی کا اقتدار
۱۵۱۳ء	بال بوا بحر اوقیانوس دریافت کرتا ہے۔
۱۵۱۷ سے ۱۵۵۵ء	عہد اصلاح۔

۱۵۱۷ء سے ۱۵۳۱ء	جرمنی میں لوتھر اصلاح کی قیادت کرتا ہے۔
۱۵۱۹ سے ۱۵۲۰ء	کورٹز میکسکو فتح کرتا ہے۔
۱۵۱۹ سے ۱۵۲۲ء	دنیا کے اطراف میگ لان کا بحری سفر۔
۱۵۱۹ سے ۱۵۵۶ء	شہنشاہ چارلس پنجم۔
۱۵۲۶ء	ہندستان میں مغلوں کی فتوحات
۱۵۲۹ء	ترک ویانا پر حملہ کرتے ہیں۔
۱۵۲۹ء سے ۱۵۳۹ء	ہنری ہشتم اصلاح کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور انگریزی کلیسا میں ابتری۔
۱۵۳۱ء	پی زارو، پیرو فتح کرتا ہے۔
۱۵۳۳ء	میکیاولی کی کتاب "پرنس"
۱۵۳۴ء	ہنری ہشتم انگریزی کلیسا کا صدر بن جاتا ہے۔
۱۵۳۶ سے ۱۵۶۴ء	کال ون، جینوا میں، پھر فرانس، اسکاٹ لینڈ اور ہالینڈ میں تحریک اصلاح کی قیادت کرتا ہے۔
۱۵۴۰ء	جیسوئٹ نظام کا قیام۔
۱۵۴۵ء	جوابی اصلاح کا عہد۔
۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء	ہندستان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ۔
۱۵۵۸ سے ۱۶۰۳ء	انگلستان میں ملکہ الزبتھ کا عہد۔
۱۵۶۱ سے ۱۶۲۶ء	سائنس داں فرانسس بے کن۔
۱۵۶۲ سے ۱۵۹۸ء	فرانس میں مذہبی جنگیں۔
۱۵۶۴ سے ۱۶۱۶ء	شکسپیر

۱۵۶۴ سے ۱۶۴۲ء	ہیئت داں گلیلو
۱۵۷۲ء سے ۱۶۰۹ء	اسپین کے خلاف اہل سونیدرلینڈ کی بغاوت۔
۱۵۸۴ء	ولیم دی سائلنٹ کا قتل۔
۱۵۸۸ء	انگریز اسپینی آرمیڈا کو شکست دیتے ہیں۔
۱۶۰۰ء	برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام۔
۱۶۰۳ سے ۱۶۸۸ء	انگلستان میں اسٹوارٹ خاندان۔
۱۶۰۷ء	ورجینیا کی نوآبادی (پہلی انگریز نوآبادی)
۱۶۱۱ء	ہندستان میں پہلی انگریزی تجارتی کمپنی۔
۱۶۱۸ سے ۱۶۴۸ء	جرمنی میں تیس سالہ جنگ۔
۱۶۲۰ء	انگلستانِ نو کی نوآبادیوں کا قیام۔
۱۶۲۸ء	ہاروے دورانِ خون کا انکشاف کرتا ہے
۱۶۲۹ سے ۱۶۵۰ء	تاج محل کی تعمیر
۱۶۳۸ء	سائبیریا کے پار روسی بحرِ اقیانوس میں پہنچتے ہیں اور روسک کا ٹلک دریافت کرتے ہیں۔
۱۶۴۲ء	انگلستان میں خانہ جنگی۔ بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان جنگ۔
۱۶۴۲ سے ۱۷۲۷ء	آیزک نیوٹن ریاضی داں۔
۱۶۴۳ء سے ۱۷۱۵ء	فرانس کا بادشاہ لوئی چہاردہم۔
۱۶۴۴ء	اہلِ مانچو چین فتح کر لیتے ہیں۔

سنہ	واقعہ
۱۶۴۸ء	ویسٹ فیلیا کا معاہدہ
۱۶۴۹ء سے ۱۶۵۹ء	انگلستان میں کرامول کا دورِ حکومت
۱۶۸۳ء	ترک ویانا پر حملہ کرتے ہیں۔
۱۶۸۹ء	انگریزی پارلیمنٹ ولیم سوم کو تخت پر بٹھاتی ہے۔
۱۶۹۶ سے ۱۷۲۰ء	روس کا شہنشاہ پیٹر اعظم۔
۱۷۰۱ سے ۱۷۱۳ء	اسپینی تخت کے لیے لڑائی۔
۱۷۰۴ء	جبرالٹر پر برطانیہ کا قبضہ۔
۱۷۱۳ء	روٹ رخ کا صلح نامہ۔
۱۷۱۵ء سے ۱۷۷۴ء	شاہ فرانس پندرھواں لوئی
۱۷۴۰ سے ۱۷۴۸ء	آسٹریا کے تخت کے لیے جنگ۔
۱۷۴۰ سے ۱۷۸۶ء	فریڈرک دوم (اعظم) شاہ پروشیا۔
۱۷۵۰ سے ۱۸۵۰ء	صنعتی انقلاب کا عہد۔
۱۷۵۲ء	ڈیبٹ ریاٹ کی انسائیکلوپیڈیا۔
۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء	سات سالہ جنگ۔
۱۷۵۹ء	ولف کیوبک لے لیتا ہے۔
۱۷۶۳ء	عہد نامہ پیرس: کنیڈا برطانیہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔
۱۷۶۴ء سے ۱۷۷۹ء	دریافت کے سلسلے میں کک کی بحری سیاحتیں۔
۱۷۶۵ء	آسٹریا میں جوزف دوم کا اقتدار۔

۱۷۷۵ء، ۱۷۸۳ء	امریکی جنگ آزادی۔
۱۷۸۳ء	عہدنامۂ ورسائی۔
۱۷۸۸ء	آسٹریلیا میں پہلی نوآبادی۔
۱۷۸۹ء	انقلابِ فرانس کی ابتدا۔
۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۷ء	واشنگٹن، صدر ممالکِ متحدہ امریکہ۔
۱۷۹۲ء سے ۱۸۱۵ء	انقلابی اور نیپولینی جنگیں۔
۱۷۹۶ء	جینر ٹیکہ اندازی شروع کرتا ہے۔
۱۷۹۹ء، ۱۸۱۵ء	فرانس میں نپولین کا اقتدار۔
۱۸۰۷ء	برطانوی پارلیمنٹ غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دیتی ہے۔
۱۸۱۴ء	نیوزی لینڈ میں پہلی نوآبادی۔
۱۸۱۴ء	جارج اسٹیفن سن پہلا انجن بناتا ہے۔
۱۸۱۵ء	ویانا کی کانگریس۔
۱۸۱۵ء	مقدس اتحاد۔
۱۸۲۹ء، ۱۸۳۷ء	جیکسن، صدر ممالک متحدہ امریکہ۔
۱۸۳۲ء	انگریزی رفارم بل۔
۱۸۳۳ء	برطانوی مملکت میں غلامی کا انسداد۔
۱۸۴۰ء	نیوزی لینڈ، برطانوی سلطنت کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔
۱۸۴۶ء	عملِ جراحی میں بے ہوش کرنے کا طریقہ پہلی بار استعمال ہوتا ہے۔

۱۸۴۸ء	"انقلابوں کا سال"۔
۱۸۴۹ء	میزانی کے تحت رومی جمہوریت۔
۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۳ء	لِونگ اسٹن کی سیاحتیں افریقہ میں۔
۱۸۵۲ء سے ۱۸۹۵ء	پاسچر جراثیم کے متعلق دریافتیں کرتا ہے۔
۱۸۵۴ء سے ۱۸۵۶ء	جنگِ کریمیا۔
۱۸۵۹ء	ڈاروِن کی کتاب "آریجن آف اسپیشیز"
۱۸۶۰ء	گیری بالڈی جنوبی اطالیہ کو آزاد کرتا ہے۔
۱۸۶۰ء	لِن کولن ممالکِ متحدہ کا صدر منتخب ہوتا ہے۔
۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء	امریکی خانہ جنگی۔
۱۸۶۵ء	لن کولن کا قتل۔
۱۸۶۶ء	آسٹریا اور پروشیا کے درمیان جنگ۔
۱۸۶۷ء	کنیڈا کی سلطنت کا قیام۔
۱۸۶۷ء	آسٹریا اور ہنگری میں مساوات۔
۱۸۷۰ء	اطالیہ کا اتحاد۔ رؤمہ اس کا صدر مقام۔
۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۱ء	فرانس اور پروشیا کی جنگ۔
۱۸۷۱ء	جرمن سلطنت کا قیام۔
۱۸۷۷ء سے ۱۸۷۸ء	روس اور ترکی کی جنگ۔
۱۸۷۸ء	ہیگ میں صلح کانفرنس۔
۱۹۰۰ء	آسٹریلیا کی دولتِ عامہ کا قیام۔
۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۹ء	ولسن صدر ممالکِ متحدہ۔

سنہ ۱۹۰۶ء	ٹرانسوال کو حکومت خود اختیاری دی گئی۔
سنہ ۱۹۰۹ء	پیری، قطب شمال پہنچتا ہے۔
سنہ ۱۹۰۹ء	رودبار انگلستان کے پار پہلی دفعہ ہوائی جہاز کی پرواز۔
سنہ ۱۹۱۰ء	جنوبی افریقہ کی یونین کا قیام۔
سنہ ۱۹۱۱ء	امنڈسن قطبِ جنوبی پہنچتا ہے۔
سنہ ۱۹۱۲ء	چینی جمہوریہ کا قیام۔
سنہ ۱۹۱۲ء	اسکاٹ قطبِ جنوبی پہنچتا ہے۔
سنہ ۱۹۱۴ء سنہ ۱۹۱۸ء	یورپی جنگِ عظیم۔
سنہ ۱۹۱۷ء	روسی انقلاب۔ بالشویک اقتدار حاصل کرتے ہیں۔
سنہ ۱۹۱۸ء	انگلستان میں عورتوں کو حقِ رائے دہی عطا کیا جاتا ہے۔
سنہ ۱۹۱۸ء	جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ وغیرہ میں انقلاب۔
سنہ ۱۹۱۹ء	پیرس میں صلح کانفرنس۔
سنہ ۱۹۱۹ء	مجلسِ اقوام کا قیام۔
سنہ ۱۹۱۹ء	ہندستانی اصلاحات کی اسکیم۔
سنہ ۱۹۲۱ء	آئرلینڈ کو حکومت خود اختیاری عطا کی گئی۔

ہماری زبان

انجمنِ ترقی اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے
چندہ سالانہ ایک رُپیہ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمنِ ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔
اس میں ادب اور اُردو کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں، اُن پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے۔ سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالہ سائنس

انجمنِ ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے۔)
اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔
دُنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا جتنی یا ایجادیں ہو رہی ہیں اُن کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔
قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتا:۔ معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمنِ ترقی اُردو (ہند) دہلی